وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اور اللہ تعالیٰ کے پیارے پیارے نام ہیں پس اسے انہی ناموں سے پکارو

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے متعلق انتہائی اہم بنیادی اور زریں قواعد پر
مشتمل فضیلۃ الشیخ علامہ محمد بن الصالح العثیمین رحمہ اللہ کی عظیم کتاب
"القواعد المثلیٰ فی الاسماء والصفات" کا اردو ترجمہ

المسمّٰی

توحید اسماء وصفات

ترجمہ وتقدیم

عبداللہ ناصر الرحمانی

نام کتاب : **توحید اسماء وصفات** (القواعد المثلی فی صفات اللہ وأسمائه الحسنی **کا اردو ترجمہ**)

مولف : فضیلۃ الشیخ علامہ محمد بن صالح العثیمین (رحمۃ اللہ علیہ)

مترجم : شیخ عبداللہ ناصر الرحمانی

صفحات : ۱۶۸

ناشر : مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام

انتساب

میرا یہ متواضع سا عمل میرے شیخ، امیر اور مربی علامہ بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ کے نام منسوب ومعنون ہے۔ جنہوں نے مجھ ناچیز کو، جو درحقیقت آپ کا نوکر بننے کا بھی اہل نہیں تھا ایک طویل شرف خدمت ومصاحبت عطا فرمایا، یہ حقیری کوشش اسی تعلق وتوجہ کی ایک جھلک ہے۔ توحید اسماء وصفات کے موضوع پر شیخ رحمہ اللہ کی کتاب'' توحیدِ خالص'' ایک فقید المثال اور عدیم النظیر تألیف ہے۔ پاکستان میں توحید اسماء وصفات میں مسلکِ سلف کی ترجمانی میں شیخِ محترم کا کردار انتہائی وافر اور نمایاں ہے۔

میں اپنے شیخ رحمہ اللہ کو توحید اسماء وصفات میں، منہج سلف کے اثبات واقرار اور اس حوالے سے متاولین، متکلمین، حلولیہ، وجودیہ اور دیگر مشبوھین کے اوہام وشبہات کی تردید وتفنید میں اپنے دور کا ابن تیمیہ تصور کرتا ہوں۔

عاملہ اللہ بلطفہ ورضوانہ ،وتغمدہ برحمتہ وغفرانہ ،وأسکنہ اعلیٰ درجاتہ وفسیح جنانہ. (رحم اللہ امرأ قال آمینا)

عبداللہ ناصر الرحمانی

نمبر شمار	فہرست مضامین

تقریظ

سماحۃ الشیخ الامام عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلیٰ آلہ واصحابہ ومن اهتدی بهداه، أما بعد

ایک انتہائی عظیم الشان کتاب ہماری نظر سے گزری، جو ہمارے بھائی فضیلۃ الشیخ علامہ محمد بن صالح العثیمین کی تالیف ہے، جس کا موضوع توحیدِ اسماء وصفات ہے اور نام ”القواعد المثلیٰ فی صفات اللہ وأسمائه الحسنیٰ“ ہے۔

میں نے اس کتاب کو اول سے آخر تک سنا، اور اسے بڑی علمی اور واضح کتاب پایا، یہ کتاب اسماء وصفات کے باب میں سلف صالحین کے عقیدہ پر مشتمل ہے، اس میں اسماء وصفات کے تعلق سے انتہائی اہم قواعد، اور بہت سے علمی نکات ذکر ہوئے ہیں، خاص طور پر قرآن وحدیث میں وارد اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت اور اس کی دونوں قسموں :معیتِ خاصہ اور معیتِ عامہ کا اہل السنۃ والجماعۃ سلف صالحین کی روشنی میں بڑی نفیس بحث موجود ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق حق ہے، اور اپنی اس حقیقت پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، یہ معیت مخلوق کے ساتھ اختلاط اور امتزاج کو ہرگز متقاضی نہیں ہے...... بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے، بالکل اسی معنی کے ساتھ جو اس کی شان کے لائق ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کی معیت مع الخلق اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی خلق کے تمام احوال وامور سے مکمل علم وآگاہی رکھنے والا، اور اپنی مخلوق کا پوری طرح احاطہ کیئے ہوئے ہے، ان کی تمام باتوں اور حرکتوں کو سنتا ہے اور ان کے تمام ظاہری وباطنی احوال کو دیکھتا ہے (یہ معیتِ عامہ کا معنی ہے) جبکہ معیتِ خاصہ جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء واولیاء اور جملہ مؤمنین کے ساتھ ہے میں سابقہ تمام معانی کے ساتھ ساتھ حفاظت وصیانت اور نصرت وتائید وتوفیق وغیرہ کا معنی پایا جاتا

ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس نافع کتاب میں فرقِ باطلہ معطلہ ،مشبہہ ،حلولیہ اور قائلین وحدۃ الوجود کا انتہائی قوی اور مدلل رد موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے ،اوران کے اجر وثواب میں خوب اضافہ فرمائے ،اور ہمیں اور انہیں علم ،ہدایت اور توفیق عطا فرمائے۔

اس کتاب کے تمام پڑھنے والوں اور جملہ مسلمانوں کیلئے نافع بنادے بلاشبہ وہی دعا قبول کرنے کے اہل اور ہر چیز پہ قادر ہے۔

اس ''تقریظ'' کوفقیر الی اللہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ،اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے ،نے اپنے کاتب کو املا کروایا۔وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ.

الرئیس العام لإدارات البحوث العلمیة والإفتاء ولدعوة والارشاد

مقدمہ ازمترجم

بسم اللہ والحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ. وبعد:

زیرِ نظر مختصر مگر انتہائی جامع رسالہ موسوم بہ ''توحید اسماء وصفات'' دیارِ عرب کے عظیم محدث اور فقیہ فضیلۃ الشیخ محمد الصالح العثیمین رحمہ اللہ کی انتہائی عظیم الشان، رفیع القدر اور جامع تألیف موسوم بہ ''القواعد المثلیٰ فی صفات اللہ وأسمائہ الحسنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔

اس کتاب کا موضوع توحید اسماء وصفات ہے، جو توحید کی انتہائی اہم قسم ہے، علماءِ کرام نے توحید اسماء وصفات کے علم کو تمام علوم سے اعلیٰ، أشرف اور اہم قرار دیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: (مزید فرماتے)

'' وباب الصفات من أهم أبواب الاسلام ومن أشرف المعارف الإلٰهيه وأعظم العلوم ''یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کا باب، ابواب اسلام میں سب سے اہم، معارفِ الٰہیہ میں سب سے اشرف واکرم اور تمام علوم میں سب سے اعظم علم ہے...... اسکی وجہ بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال فی الخلق کی معرفت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات وافعال کا ذکر دیگر احکام کے ذکر سے کہیں زیادہ ہے، بعض علماء نے توحید اسماء وصفات کو نصفِ ایمان قرار دیا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''مفتاح دار السعادة ''(۸۶/۱) میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے علم کو ہر علم کا اصل کہا ہے، اور اس کی معرفت کو بندہ کی ہر سعادت وکمال اور دنیا وآخرت کی تمام مصالح کی أساس قرار دیا ہے...... یہ بھی فرمایا ہے، کہ بندہ کی تمام تر سعادت اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت کے ساتھ قائم ہے، جبکہ اسماء وصفات سے جہل، اصلِ شقاوت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث[ان لله تسعة وتسعين اسما من أحصاها دخل الجنة] (متفق علیہ) اسی سعادت کی غماز ہے؛ کیونکہ یہ حدیث واضح اعلان کررہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت حاصل کرنے والے، انکے معانی کی فقہ وفہم طلب کرنے والے اور انکے مقتضیٰ پر عمل کرنے والے کا ٹھکانہ صرف جنت ہے۔

مگر افسوس بھوائے قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ توحید کی اس انتہائی اہم قسم

کے تعلق سے بہت سے گمراہ فرقے الحادو زندقہ کا شکار ہو گئے...... چنانچہ جہمیہ جو "جہم بن صفوان" کے پیروکار تھے، نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار ہی کرڈالا، اسی لیئے انہیں "نفاۃ" یا "معطلہ" بھی کہا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "بالغ جهم في نفي التشبيه حتى قال ان الله ليس بشيء" (فتح الباری:۱۳/ ۴۲۷) یعنی جہم بن صفوان نے تشبیہ کے خودساختہ محذور سے بچنے کے لیئے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اس قدر انکار کیا کہ یہاں تک کہہ گیا کہ اللہ تعالیٰ کچھ بھی نہیں ہے۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "انا لنحكي كلام اليهود والنصرى ونستعظم ان نحكي قول جهم" (فتح الباری:۱۳/ ۴۲۸) یعنی ہم یہود ونصاریٰ کی (مبنی بر کفر) باتیں بیان کرتے ہیں مگر جہم بن صفوان کے اقوال نقل کرنا ہم پر بڑا گراں گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول بکیر بن معروف: سلم بن احوز نے جب جہم بن صفوان کو قتل کیا تو اس کا چہرہ فوراً خوفناک حد تک سیاہ ہو گیا (فتح الباری:۱۳/ ۴۲۹)

امام لالکائی فرماتے ہیں: جہم بن صفوان کا قتل ۱۳۲ھ میں ہوا (حوالہ مذکورہ۔)

دوسرا فرقہ جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں الحاد کا شکار رہا مشبھہ کا ہے، یہ مقاتل بن سلیمان کے پیروکار تھے، یہ ملاحدہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ کے قائل تھے (تعالیٰ الله عن ذلك علوا كبيرا)

فرقہ معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو الفاظ کی حد تک مانا، مگر انکے معانی ومسمّیات کا انکار کردیا۔

فرقہ اشعریہ نے اللہ تعالیٰ کی صرف سات صفات کو منہج سلف کے مطابق مانا (یعنی ان میں کسی قسم کی تاویل نہیں کی) جبکہ بقیہ تمام صفات میں اپنی من مانی کی، تاویلوں کے مرتکب ہو گئے۔

واضح ہو کہ مندرجہ بالا فرق کے مذکورہ تمام مناہج جو تعطیل، تحریف، تشبیہ یا تاویل پر قائم ہیں، اللہ تعالیٰ کی صفات میں الحاد قرار پاتے ہیں، جن سے بچنے اوران تمام ملاحدہ کو چھوڑ دینے کی تاکید وارد ہوئی ہے ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۸۰) ترجمہ: (اور اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں تم اسے انہی ناموں کے ساتھ پکارو اور ایسے لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں الحاد (کج روی) کرتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے کیئے کی ضرور سزا ملے گی)

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں الحاد کی ان تمام صورتوں نے سلف صالحین کو بتلائے حیرت کردیا، چنانچہ انہوں نے ان ملاحدہ کے اقوال کو یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے مقالات سے بھی زیادہ خطرناک قراردیا،اوران سب کے رد کیلئے کمربستہ ہوگئے، کیونکہ اہلِ بدعت کی تردید وتفنید لازمی امور میں شمار ہوتی ہے،امام یحیٰی بن یحیٰی بن بکیر کا قول ہے:

''الذب عن السنة افضل من الجهاد ''یعنی سنت کا دفاع جہاد سے افضل ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اہلِ بدعت کی تردید وتفنید کے واجب ہونے پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اہلِ بدعت کی تردید کواعتکاف اور قیام اللیل سے افضل قراردیا ہے۔ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: اللہ کی رضا کیلئے اہلِ بدعت پر رد کرنے والا، مجاہدین فی سبیل اللہ، وارثینِ انبیاء اور خلفاءِ رُسل میں سے ہے۔

امام اسد بن موسیٰ نے بھی ردِ اہل بدعت کو جہاد سے افضل قراردیا ہے۔

اسی قسم کا قول حافظ ابن القیم رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

اہلِ بدعت کے تردید کی اساس رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

[من أحدث في أمرنا هذا ماليس منه فهو رد] (صحیح بخاری)

ترجمہ:[جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی وہ مردود ہے]

یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین اھل الحدیث ان تمام بدعات کے رد میں پیش پیش رہے۔جیسے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کے کتاب الایمان میں اور پھر کتاب التوحید میں قدریہ، مرجئہ، جبریہ، معتزلہ، جہمیہ، رافضہ اور جمیع اہلِ تأویل پر رد کیا۔

مسئلہ اسماء وصفات میں خاص طور سے متقدمین اور متاخرین نے کثرت سے لکھا، اور بہت سی مؤلفاتِ نافعہ تصنیف فرمائیں۔بالخصوص شیخ الاسلام کے مختلف رسائل، جن میں ''الفتوىٰ الحموية'' ''العقيدة الواسطية ''اور''الرسالة التدمرية ''خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ان کے شاگرد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے''اجتماع الجيوش الاسلامية على غزو المعطله الجهمية ''میں اسی موضوع کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔اس کے علاوہ''القصيدة النونية '' ''الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة '''' مفتاح دار السعادة ''اور ''مدارج السالكين ''میں بھی جا بجا یہ موضوع ملتا ہے۔اس کے علاوہ''اسماء الله

الحسنی'' کے نام سے بھی ان کی تالیف موجود ہے

اس کے علاوہ امام ابوالحسن الأشعری کی''الابانة عن اصول الديانة''، امام ابن خزیمہ کی''کتاب التوحید'' حافظ ابوالشیخ الاصبھانی کی''کتاب العظمة''، امام ابن قدامة المقدسی کی''لمعة الاعتقاد'' نیز''اثبات صفة العلو''۔ امام لالکائی کی''شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعة''، امام ذھبی کی''العلو للعلي الغفار''، حافظ ابن ابی العز الحنفی کی''شرح العقيدة الطحاوية''، امام ابوالقاسم الاصبہانی کی''الحجة فی بيان المحجة''، امام ابوبکر بن عاصم کی''السنة'' اور امام عثمان بن سعید الدارمی کی''الرد على البشر المريسي'' قابلِ ذکر ہیں۔

علماءِ معاصرین میں سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے تعلق سے منہج سلف صالحین کے ایضاح وتبیین کے سلسلہ میں بہت سے نمایاں نام آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں، جن میں سماحة الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، محدثِ دیارِ شام شیخ محمد ناصر الدین الالبانی، شیخ حمود بن عبداللہ التویجری رحمہم اللہ، شیخ صالح الفوزان، شیخ عمر سلیمان الأشقر، شیخ محمد خلیل ھراس، شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین، شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ عبدالعزیز محمد السلمان، شیخ محمد ربیع ھادی المدخلی، شیخ عبدالرحمٰن بن صالح المحمود، شیخ محمد حامد الفقی حفظھم اللہ قابل ذکر ہیں۔

لیکن ہم سب سے نمایاں اور متمیز مقام، کتابِ ھذا کے مؤلف فضیلة الشیخ محمد الصالح العثیمین کو دیتے ہیں، جنکے اس موضوع پر ہزاروں علمی دروس (جو سب مسجل ہیں) کے ساتھ بہت سی کتبِ نافعہ اور بہت سے متون پر شروح موجود ہیں، چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) شرح لمعة الاعتقاد للمقدسی (۲) تقريب التدمرية

(۳) شرح رسالة التدمرية، لشيخ الاسلام (۴) فتاویٰ العقيدة

(۵) المحاضرات السنية فی شرح العقيدة الواسطية، لشيخ الاسلام

(۶) ازالة الاستار عن الجواب المختار لهداية المحتار

(۷) القواعد الطيبات فی الاسماء والصفات، وغیر ذلک

زیرِ نظر کتاب''القواعد المثلیٰ فی صفات الله واسمائه الحسنیٰ'' کا موضوع کتاب کے نام سے واضح ہے، اس کتاب میں شیخ رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے حوالے سے منہجِ سلفِ صالحین کی روشنی میں بڑے نافع اور جامع قواعد بیان فرمائے ہیں۔ نیز

اللہ تعالیٰ کی صفات میں الحاد کے شکار گمراہ فرقوں جہمیہ، مشبھہ، اشعریہ وغیرہ کے ساتھ نہایت علمی مناقشہ فرمایا ہے، اور جن باطل قواعد پر انکے مذاہب کی بناء ہے، انہیں کتاب وسنت اور اقوالِ سلف کی روشنی میں غلط ثابت کر کے اس بناء کو مسمار کر دیا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب میں خاص طور پر گروہِ اُشاعرہ کا علمی محاسبہ ومؤاخذہ فرمایا ہے، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اُشاعرہ کی کثرتِ تعداد کے بڑے بڑے دعوے کیئے جاتے ہیں...... خود ہمارے برصغیر ہندو پاک میں فقہی اعتبار سے حنفی کہلانے والے عقیدہ میں اُشعری نسبت کے حامل ہیں، ان کے مدارس میں عقیدہ اشعریہ پر مشتمل کتاب "شرح العقائد النسفية" ودیگر کتب داخلِ نصاب ہیں۔

واضح ہو کہ اُشاعرہ، جہمیہ اور معتزلہ کی طرح صفات باری تعالیٰ کے منکر تو نہیں، لیکن متأول ضرور ہیں، اور تأویل کا مفسدہ انتہائی خطرناک ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فتنۂ تاویل کو، فتنۂ تعطیل سے بھی بدتر قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تأویلِ صفات کے انکارِ صفات سے زیادہ بدتر ہونے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" تاویلِ نصوص، تشبیہ، تعطیل، نصوصِ کتاب وسنت کے ساتھ کھیل اور تماشہ اور نصوص کے ساتھ بدگمانی کو شامل ہے، نیز یہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کے استخفاف کو موجب ہے۔ تاویل کا یہ راستہ اس امر کا بھی موھم ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کا ظاہر تشبیہ کا متقاضی ہے، نیز یہ کہ انکے متکلمین جو خود متحیرین ہیں، ناطقِ وحی سے زیادہ عالم اور فصیح ہیں (انتهى نقلا من كتاب "الماتريديه" للشيخ الشمس السلفي الافغاني)

توحیدِ اسماء وصفات کی خدمت اور اسکے ایضاح وبیان کے سلسلہ میں سرزمینِ پاکستان میں سرفہرست ایک ہی نام ملتا ہے، جس کا ذکر نہ کرنا جفاء اور ناانصافی ہوگی وہ نام ہمارے شیخ، مربی اور امیر فضیلۃ الشیخ بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ کا ہے، جنہوں نے سرزمینِ پاکستان نیز بیرون ممالک میں تاویلِ صفات کے جمود کو توڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا، جسکی گواہی آپکی تفسیر "بديع التفاسير" آپکی انتہائی جامع اور قیم کتاب "توحیدِ خالص" نیز "توحیدِ ربانی" اور ان سب کے ساتھ ساتھ آپکے علمی محاضرات وخطبات دیں گے (فجزاه الله خيرا)

قارئین کرام: اس کتاب اور اس موضوع کی دیگر تمام کتب کے سلسلہ میں ہماری تمام محنت اور کدوکاوش اس امر کی متقاضی ہے کہ توحیدِ اُسماء وصفات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے، اور وہ وہی فہم

ہے جس پر سلف صالحین، صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور أئمہ سلف قائم تھے، جو چند جملوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ کتاب وسنت میں مذکور اللہ تعالیٰ کے تمام أسماء وصفات ثابت وحق ہیں، ان پر ایمان لانا واجب ہے، اور وہ ایمان بلاتعطیل، بلاتحریف، بلاتکییف، بلاتشبیہ اور بلاتأویل ہو...... بقیہ تمام تفصیلات کتاب کے مطالعہ سے آپ کے سامنے آجائیں گی۔

کتاب کے سلسلہ میں ایک ضروری گزارش یہ ہے کہ ممکن ہے بعض قارئین کیلئے بعض دقیق مباحث کا فہم کچھ مشکل ہو، ہم انہیں ان مباحث کے فہم کیلئے علماء سے رجوع کا مشورہ دینگے۔ یہ بات موجب اجر بھی ہوگی اور معاونِ فہم بھی، نیز کسی غلطی سے محفوظ رہنے کا باعث بھی ہوگی۔

کتاب ہذا کی تیاری میں سب سے وافر حصہ ہمارے فاضل دوست فضیلۃ الشیخ علی بن عبداللہ التمیمی رئیس "مکتبہ عبد اللہ بن سلام" کی انتہائی مفید توجیہات وارشادات کا ہے، نیز ان کا جمیع مراحل میں تعاون بھی انتہائی قابلِ قدر ہے، کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں ہمارے فاضل شاگرد مولانا داؤد شاکر کے گرانقدر تعاون کو فراموش کرنا ناممکن ہے، کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ، تخریج اور پروف ریڈنگ وغیرہ میں ان کا تعاون انتہائی مثالی اور قابلِ تعریف ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ کے سلسلہ میں ہمارے شاگرد حافظ زبیر اسماعیل، اور طباعت کے سلسلہ میں سعد بن عبدالعزیز جو مکتبہ عبداللہ بن سلام کے مارکیٹنگ منیجر بھی ہیں کی محنتِ شاقہ حوصلہ افزاء ہے۔ ہمارے شاگرد، عبداللہ شمیم اور عثمان صفدر طالبعلم المعہد السلفی، جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمی اعتبار سے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے، نے بھی کتاب کے جملہ مراحل کی تیاری میں بھرپور ساتھ دیا، مستقبل میں ان سے علمی میدان میں اچھی توقعات وابستہ ہیں (زادھم اللہ علما)

اللہ تعالیٰ ان سب ساتھیوں کو سعادت دارین سے نوازے، اور میری اس سعی متواضع کو روزِ قیامت میرے میزانِ حسنات کا ذخیرہ بنادے، اس کتاب کا نفع عام فرمادے، میرے لیئے، اور میرے والدین واساتذہ کرام کیلئے اسے بطورِ صدقہ جاریہ قبول فرمالے، اور ہمارا یہ بے راہ روی کا شکار معاشرہ جو توحید اور اطاعت ومحبتِ رسول ﷺ سے دوری کی وجہ سے تباہی کے کنارے پر کھڑا ہے، ہدایت وتوفیق عطا فرمادے (وھو السمیع القریب المجیب الدعوات وبنعمته تتم الصالحات، وصلى الله على نبيه و آله وصحبه وأهل طاعته أجمعين.

وکتب ذلک / عبداللہ ناصر الرحمانی عفا اللہ عنہ

مدیر: مکتبة عبدالله بن سلام لترجمة كتب الاسلام فرع (۱)

الحمدلله ، نحمده ونستعينه ونستغفره ونتوب اليه ،ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ،من يهده الله فلامضل له ومن يضلل فلاهادى له ، وأشهد أن لا اله الا الله وحده لاشريک له،وأشهد أن محمدا عبده ورسوله، صلى الله عليه وعلى اله واصحابه ،ومن تبعهم باحسان ، وسلم تسليما . وبعد :

ایمان باللہ کے ارکان میں سے ایک اہم رکن اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا ہے، ایمان باللہ کے ارکان یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر ایمان۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر ایمان۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے علم کا مقام ومرتبہ:

توحید اسماء وصفات، توحید کی تین اقسام میں سے ایک مستقل قسم ہے۔(وہ تین اقسام یہ ہیں)

(۱) توحیدِ ربوبیت

(۲) توحیدِ الوہیت

(۳) توحیدِ اسماء وصفات

توحید اسماء وصفات (جو ہمارے اس رسالے کا اصل موضوع ہے) کا دین میں مقام ومرتبہ بہت اونچا ہے اور اسکی اہمیت نہایت عظیم ہے، انسان کے لئے اس وقت تک مکمل واکمل طریقے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت ممکن نہیں ہے جب تک اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا علم نہ ہو۔(اس علم کی برکت سے) وہ بڑی بصیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾(الاعرف:۱۸۰)

ترجمہ:(اللہ تعالیٰ کے پیارے پیارے نام ہیں پس انہی ناموں کے ساتھ اسے پکارو)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ دعا کرنے کا حکم ہے،اس دعا سے مراد دعاءِ مسئلہ بھی ہے اور دعاءِ عبادت بھی۔دعاءِ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ آپ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجت رکھیں تو ایسے نام کا واسطہ دیں جو آپ کی حاجت کے مطابق اور مناسب ہے،

مثلاً: یَاغَفُوْرُاغْفِرْلِیْ (اے گناہوں کے معاف فرمانے والے! مجھے معاف فرمادے)

یَارَحِیْمُ اِرْحَمْنِیْ (اے رحیم! مجھ پر رحم فرما۔

یَاحَفِیْظُ اِحْفَظْنِیْ (اے حفیظ! میری حفاظت فرما۔

دعاءِ عبادت کی صورت یہ ہے کہ آپ ان اسماء وصفات کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس ذات کی بندگی کریں۔مثلا:

آپ توبہ کریں؛ کیونکہ وہ اللہ "التواب "یعنی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

آپ اپنی زبان سے اس کا ذکر کریں؛ کیونکہ وہ "السمیع "یعنی سننے والا ہے۔

آپ اپنے اعضاء سے اس کی بندگی کریں؛ کیونکہ وہ "البصیر" دیکھنے والا ہے۔

آپ تنہائیوں اور دل کی گہرائیوں سے اس سے ڈرتے رہیں؛ کیونکہ وہ "اللطیف الخبیر" یعنی بڑا ہی باریک بین اور باخبر رہنے والا ہے۔اس طرح دیگر اسماء وصفات کے تقاضوں پر غور کرتے جائیے۔

اس کتاب کا سببِ تألیف:

توحیدِ اسماء وصفات کے علم کے اس مقام ومرتبہ کے پیشِ نظر،اور نیز یہ دیکھتے ہوئے کہ اس علم کے حوالے سے لوگوں کی گفتگو کبھی تو مبنی برحق ہوتی ہے اور کبھی محض باطل،اور باطل گفتگو کے پیچھے کبھی تو ان کی جہالت کارفرما ہوتی ہے اور کبھی تعصب، میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اس مبارک علم کے حوالے سے کچھ قواعد تحریر کردوں۔

اللہ تعالیٰ سے اس امید اور دعا کے ساتھ کہ وہ میرے اس عمل کو اپنی ذات کیلئے خالص اور اپنی رضا کے عین موافق بنادے، نیز اسے اپنے بندوں کیلئے نفع بخش بنادے۔ میں نے اس رسالے کا نام ''اَلْقَوَاعِدُ الْمُثْلٰی فِیْ صِفَاتِ اللهِ وَأَسْمَائِهِ الْحُسْنٰی'' رکھا ہے۔

(محمد صالح العثیمین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الفصل الاول

﴿اللہ تعالیٰ کے اسماء (ناموں) کے سلسلہ میں قواعد﴾

پہلا قاعدہ:

﴿اللہ تعالیٰ کے تمام نام "حسنیٰ" یعنی اچھے اور پیارے ہیں﴾

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (الاعراف:۱۸۰)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ (پیارے پیارے نام) ہیں)

"حُسْنٰی" سے مراد یہ کہ ایسے نام جو حسن وخوبی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں ان کے اندر پوشیدہ صفات اس قدر کامل ہیں کہ ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں پایا جاتا، نہ فعلاً کوئی نقص موجود ہے اور نہ احتمالاً کسی نقص کی گنجائش ہے۔

مثال نمبر (1) "اَلْحَیُّ" یعنی (زندہ) یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جو اپنے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی حیاتِ کاملہ کا معنی لیئے ہوئے ہے، ایسی حیات جس سے قبل کوئی عدم نہیں تھا اور نہ کبھی اسے زوال یا فنا لاحق ہوگا...... ایسی حیات جو علم، قدرت اور سمع وبصر وغیرہ جیسی صفاتِ کمال کو پوری طرح مستلزم ہو۔

مثال نمبر (2) اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام "اَلْعَلِیْمُ" یعنی (جاننے والا) ہے۔ یہ اسمِ مبارک، اللہ تعالیٰ کے ایسے علم کامل کو اپنے ضمن میں لیئے ہوئے ہے جس سے قبل کسی قسم کا کوئی جہل نہیں تھا اور نہ اسے کبھی کوئی نسیان لاحق ہوگا...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰى﴾ (طٰہٰ:۵۲) ترجمہ: (ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں موجود ہے، نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے)

اس ذاتِ علیم کا علم اتنا وسیع ہے کہ وہ جملۃً وتفصیلاً ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اپنے اور اپنی تمام مخلوقات کے جملہ افعال سے خوب خوب آگاہ ہے۔

درج ذیل آیات کریمہ ملاحظہ ہوں:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الانعام:۵۹)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں (خزانے) ہیں ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے۔ اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے، مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں)

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾ (ھود:٦)

ترجمہ: (زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں، وہی انکے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور انکے سونپے جانے کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے)

﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (التغابن:۴)

ترجمہ: (وہ آسمان وزمین کی ہر ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم چھپاؤ اور جو ظاہر کرو وہ (سب کو) جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کی باتوں تک کو جاننے والا ہے)

مثال نمبر (3) اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام "اَلرَّحْمٰنُ" ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کو اپنے ضمن میں لیئے ہوئے ہے، جس رحمتِ کاملہ کا رسول اللہ ﷺ نے اپنی حدیث میں یوں ذکر کیا [لله ارحم بعباده من هذه بولدها] ترجمہ: [اس عورت کے دل میں اپنے

بچے کیلئے جو رحمت و محبت ہے، اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت فرماتا ہے]

یہ بات رسول اللہ ﷺ نے ایک ماں کے متعلق فرمائی جو بڑی بے چینی سے اپنا گمشدہ بچہ تلاش کر رہی تھی بالآخر جنگی قیدیوں کے درمیان اسے پا لیتی ہے اور اپنے سینے سے چمٹا کر اسے دودھ پلانے لگتی ہے۔ یہ واقعہ صحیح بخاری (۵۹۹۹) و مسلم کتاب الرقاق میں امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی روایت سے موجود ہے۔

نیز ''الرحمٰن'' نام اس وسیع رحمت کو ضمن میں لیئے ہوئے ہے جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶)

ترجمہ: (میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے)

نیز ملائکہ کی مؤمنین کیلئے قرآن میں مذکور دعا کے اندر بھی اس وسیع رحمت کا ذکر ہے۔

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (المؤمن:۷)

ترجمہ: (اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنی بخشش اور علم سے گھیر رکھا ہے)

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں حسن و خوبی ایک تو اس اعتبار سے ہے کہ اس کا ہر نام اپنی جگہ انتہائی خوبصورت اور پیارا ہے......اور دوسری اس اعتبار سے کہ ایک نام کو دوسرے نام کے ساتھ ملا کر ذکر کرنے میں مزید حسن و کمال حاصل ہوتا ہے۔

اس کی مثال: ''العزیز الحکیم'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے ان دونوں ناموں کو بہت سی جگہوں پر ذکر کیا ہے۔ جس سے ان دونوں ناموں میں سے ہر نام میں دوسرے نام کی وجہ سے ایک خصوصی کمال حاصل ہو گیا۔ اور وہ اس طرح کہ ''العزیز'' میں عزۃ یعنی (غلبہ) کا معنی، جبکہ ''الحکیم'' میں حکم اور حکمت کا معنی پایا جاتا ہے۔ (یہ دونوں وصف ''غلبہ اور حکمت'' اللہ تعالیٰ میں بدرجۂ کمال موجود ہیں) لیکن ان دونوں کو اکٹھا کرنا ایک اور کمال پر دلالت کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا غالب ہونا، حکمت کے ساتھ مقرون ہے، چنانچہ اس کا غالب ہونا کسی

ظلم وزیادتی کو متقاضی نہیں ہے، جیسا کہ انسانوں میں سے کسی کو کہیں کچھ غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ اپنے غلبہ اور طاقت کے بل بوتے پر ظلم و جور اور غلط تصرفات جیسے گناہوں پر اتر آتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ''الحکیم'' ہونا ''العزیز'' کے ساتھ مقرون ہے، چنانچہ اس کا حکم وحکمت، غلبۂ کامل کے ساتھ ہے جو ہر قسم کے ضعف یا ذلت سے پاک ہے۔ جبکہ انسانوں کا حکم یا حکمت ہمیشہ کسی نہ کسی طور ضعف وذلت کا شکار رہتا ہے۔

دوسرا قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کے اسماء، اعلام واوصاف ہیں﴾

اللہ تعالیٰ کے تمام نام علَم ہیں، اس لحاظ سے کہ وہ اس کی ذات پر دلالت کرتے ہیں، نیز وہ سب کے سب وصف بھی ہیں، اس لحاظ سے کہ ان تمام ناموں کے اندر معانی موجود ہیں جو اس کی ذات کے ساتھ صفات کی حیثیت سے قائم ہیں۔ اب یہ سارے نام بحیثیت علَم ہونے کے، آپس میں مترادف ہیں؛ کیونکہ ان سب کا مسمی ایک ہی ہے اور وہ اللہ عزوجل ہے، اور بحیثیت اوصاف ہونے کے یہ تمام نام آپس میں متباین ہیں کیونکہ ہر نام اپنے خاص معنی پر دلالت کررہا ہے۔

چنانچہ ''الحی، العلیم، القدیر، السمیع، البصیر، الرحمن، الرحیم، العزیز، الحکیم'' یہ سب ایک ہی ذات کے نام ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن ''الحی'' کا اپنا معنی ہے جو ''العلیم'' کا نہیں، اور ''العلیم'' کا اپنا معنی ہے جو ''القدیر'' کا نہیں......

واضح ہو کہ ہم نے جو یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر نام علَم ہے اور وصف بھی، تو یہ حقیقت خود قرآن نے بتلادی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الاحقاف: ۸) ترجمہ: (وہ ذات غفور رحیم ہے)

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوْا لرَّحْمَةِ﴾ (الکھف: ۵۸)

ترجمہ: (تیرا رب غفور ہے اور رحمت والا ہے)

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''الرحیم'' بھی ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ رحمت والا ہے یعنی صفتِ رحمت سے متصف ہے۔ پھر لغت اور عرفِ عام میں یہ بات اجماع کا درجہ رکھتی ہے کہ ''علیم'' اسے ہی کہا جائے گا، جس میں علم کا وصف ہو اور ''سمیع'' اسے ہی کہا جائے گا، جس میں ''سمع'' (سننے) کا وصف ہو۔ اور ''بصیر'' وہی کہلائے گا جس میں بصر (دیکھنے) کی صفت ہو۔ اور یہ بات اس قدر واضح اور صریح ہے کہ اسے ثابت کرنے کیلئے کسی دلیل کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ان معطلہ کی گمراہی اور ضلالت کھل کر سامنے آ گئی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو، ان سے معانی سلب کر کے مانا۔ چنانچہ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''سمیع'' ہے لیکن بلا سمع۔ ''بصیر'' ہے، لیکن بلا بصر۔ ''عزیز'' ہے، لیکن بلا عزۃ...... وھکذا۔ یعنی سمیع ہے، لیکن سنتا نہیں، بصیر ہے، لیکن دیکھتا نہیں، اور عزیز ہے، لیکن غلبہ حاصل کرنے والا نہیں۔

انہوں نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ ان اسماء کے اندر پائے جانے والے معنی یا صفت کا ثبوت تعددِ قدماء کو مستلزم ہے...... لیکن یہ علت، علیل یعنی مریض بلکہ میت ہے؛ کیونکہ قرآن وحدیث اور عقل سب کے سب اسے باطل قرار دیتے ہیں...... جہاں تک قرآن وحدیث کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے باوجودیکہ وہ ''الواحد الاحد'' (اکیلا) ہے، مگر اپنے آپ کو بہت سی صفات کے موصوف ہونے کے طور پر ذکر فرمایا، مثلاً فرمایا:

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ. اِنَّہٗ ھُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ. وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ. ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ. فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ (البروج:۱۲تا۱۶)

ترجمہ: (یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ وہ بڑا بخشش کرنے والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔ عرش کا مالک عظمت والا ہے۔ جو چاہے اسے کر گزرنے والا ہے)

نیز فرمایا: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی . الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی . وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی . وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی . فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی﴾ (الاعلٰی: ۱تا۵)

ترجمہ: (اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر۔ جس نے پیدا کیا اور صحیح سالم بنایا۔ اور جس نے (ٹھیک ٹھاک) اندازہ کیا اور پھر راہ دکھائی۔ اور جس نے تازہ گھاس پیدا کی۔ پھر اسے (سکھا کر) سیاہ کوڑا کر دیا)

ان آیاتِ کریمہ میں ایک ہی موصوف کے بہت سے اوصاف مذکور ہیں، لیکن ان بہت سے اوصاف سے تعددِ قدماء لازم نہیں آتا۔

عقل بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے، چنانچہ کوئی ذات اگر بہت سی صفات سے متصف ہو تو یہ بہت سی صفات اس ذاتِ موصوف سے متباین نہیں ہیں کہ جن کو ثابت کرنے سے تعددِ موصوف لازم آتا ہو، بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ ایک ہی ذاتِ موصوفہ کی مختلف ومتعدد صفات ہیں جو اس کے ساتھ قائم ہیں۔ اور ہر وہ شئ جو موجود ہو اس میں مختلف صفات کا پایا جانا ضروری ہے، چنانچہ اگر کسی کو ''الموجود'' کہا جائے تو اس میں صفتِ وجود (پایا جانا) آ گئی، پھر یہ بھی کہ وہ ''واجب الوجود'' ہے یا ''ممکن الوجود''، نیز یہ کہ اس کا وجود ذاتی ہے جو قائم بنفسہ ہے یا ایسے وصف کے طور پر ہے کہ جو کسی شئ میں پایا جائے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ''الدھر'' (زمانہ) اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے نہیں ہے؛ کیونکہ ''الدھر'' ایک جامد نام ہے جس میں ایسا کوئی معنی یا وصف نہیں جو اسے اسماءِ حسنٰی کے ساتھ ملحق ہونے کے لائق بنائے۔ اور اس لیئے بھی کہ ''الدھر'' محض وقت یا زمانہ کا نام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے منکرینِ قیامت کے بارہ میں فرمایا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾

ترجمہ: (انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں

اور ہمیں صرف زمانہ ہی مارڈالتا ہے)(الجاثیۃ:۲۴)

یہاں الدھر سے ان کی مراد وقت ہے یعنی راتوں اور دنوں کا گزرنا۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو''الدھر'' کہا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[یؤذینی ابن آدم یسب الدهر وأنا الدهر بیدی الامر أقلب اللیل وا لنهار]

ترجمہ:[ابنِ آدم، مجھے تکلیف دیتا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ دھر یعنی زمانے کو گالی دیتا ہے، اور دھر تو میں ہوں](صحیح بخاری (۴۸۲۶،۶۱۸۱،۷۴۹۱) صحیح مسلم (۴۵۸/۵))

اس حدیث میں ایسی کوئی دلالت نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ''دھر'' اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے؛ کیونکہ جو لوگ''دھر'' کو گالی دیتے تھے، ان کی مراد اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ زمانہ ہوتا جو کہ حوادث ومصائب کا محل ہے۔

اس حدیث کے لفظ'' أنا الدهر'' کا معنی وہی ہوگا جو حدیث نے خود تفسیر کر کے یہاں بیان کردیا یعنی[بیدی الامر أقلب اللیل والنهار] میں زمانہ ہوں......میرے ہاتھ میں امر ہے، میں رات اور دن کو پھیرتا ہوں...... چنانچہ اللہ تعالیٰ خود دھر نہیں ہے بلکہ دھر اور جو کچھ اس میں ہے اس کا خالق ہے۔

اس حدیث نے یہ بھی بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ''دھر''(رات دن) کو پھیرنے والا ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ''مقلِّب''، یعنی (پھیرنے والا) مقلَّب (جس کو پھیرا جاتا ہو) بن جائے......لہذا واضح ہو کہ اس حدیث میں دھر سے مراد اللہ تعالیٰ نہیں ہے۔

تیسرا قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں جو صفات اور معانی ہیں وہ یا تو متعدی ہوں گے یا لازم﴾

اگر متعدی ہوں تو ان پر ایمان تین چیزوں کے اثبات سے مکمل ہوگا۔

(۱) یہ ایمان لانا کہ یہ اسم (نام) اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے۔

(۲) یہ ایمان لانا کہ یہ نام جس صفت کو متضمن ہے وہ صفت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے

(۳) یہ ایمان لانا کہ اس صفت کا حکم اور مقتضیٰ بھی ثابت ہے۔

اس اصل کو سامنے رکھتے ہوئے اہلِ علم نے ایک فقہی مسئلہ استخراج کیا ہے اور وہ یہ کہ وہ ڈاکو جو پکڑے جانے سے قبل توبہ کرلے تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے:

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡهِمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾

ترجمہ: (ہاں جو لوگ اس سے پہلے توبہ کرلیں کہ تم ان پر قابو پا لو تو یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑی بخشش اور رحم وکرم والا ہے) (المائدۃ:۳۴)

وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے آخر میں اپنے دو نام ''غفور رحیم'' ذکر فرمائے، جن کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والے ڈاکو کے گناہ کو معاف کر دیا اور ان پر رحم فرما دیا اس طرح کہ ان کی ڈاکہ زنی کی حد ساقط کردی۔

وصفِ متعدی کی مثال: ''السمیع'' (سننے والا) ہے

اس میں پہلا واجب یہ ہے کہ ''السمیع'' کا بطورِ نام اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات ہو۔

دوسرا واجب یہ ہے کہ ''السمیع'' کا بطورِ صفت اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات ہو۔

تیسرا واجب یہ کہ اس کے حکم اور مقتضیٰ کا بھی اثبات ہو۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر مخفی بات اور سرگوشی کو سن لیتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاللّٰهُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ بَصِیۡرٌ﴾

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ تم دونوں کے سوال وجواب سن رہا تھا، بے شک اللہ تعالیٰ سننے دیکھنے والا ہے) (المجادلۃ:۱)

اور اگر اللہ تعالیٰ کا نام ایسے وصف پر مشتمل ہو جو غیر متعدی یعنی لازم ہے، تو اس پر ایمان کی

تکمیل دوامور سے ہوگی۔

(۱) یہ ایمان لانا کہ یہ اسم (نام) اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے۔

(۲) یہ ایمان لانا کہ اس اسم کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جوصفت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا مبارک نام''الحی''(زندہ) ہے، ضروری ہے کہ''الحی'' کوبطورِ نام اوراس کے ضمن میں جوحیاۃ کا معنی ہے اسے بطورِ صفت، اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہونے کا ایمان رکھا جائے۔

چوتھا قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کی ذات وصفات پر مطابقۃً وتضمناً والتزاماً دلالت کرتے ہیں﴾

مثلاً اللہ تعالیٰ کا اسمِ مبارک''الخالق''اس کی ذات پر، اوراس اسم کے اندر موجود صفتِ خلق پر مطابقۃً دلالت کرتا ہے، جبکہ صرف اس کی ذات پر اور صرف صفتِ خلق پر تضمناً دلالت کرتا ہے......اور صفتِ علم وقدرت پر التزاماً دلالت کرتا ہے......(یعنی جوذات خالق ہے وہ لازماً علیم بھی ہے اور قدرت والی بھی ہے)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کا ذکر کرکے، آگے فرمایا: ﴿لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّأَنَّ اللّٰہَ قَدْ أَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (الطلاق:۱۲) ترجمہ: (تاکہ تم جان لوکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبارِ علم گھیر رکھا ہے) (گویا پیدا کرنے والی ذات لازمی طور پر علم وقدرت والی ہوگی) علمی مباحث میں، دلالت التزامی ایک طالبِ علم کے بہت کام آسکتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اسے تدبرِ معنی کا ملکہ حاصل ہو، اور اللہ تعالیٰ اسے دوحقیقتوں کے اندر پائے جانے والے تلازم کا فہم عطا فرمادے۔ اس فہم کی برکت سے وہ ایک ہی دلیل سے بہت زیادہ مسائل کا استخراج کرسکتا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کسی فرمان کا لازم (بشرطیکہ اس کا لازم بننا صحیح

ہو) حق تصور کیا جائے گا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا ہر فرمان حق ہے، اور حق کا لازم بھی حق ہوگا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول کے کلام کے لازم کو خوب جاننے والا ہے، لہذا وہ لازم حقیقۃً مراد ہوگا۔[1]

البتہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے علاوہ کسی کے قول سے کچھ لازم آنا مفہوم ہو رہا ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ اس لزوم کو اس کے قائل کے سامنے ذکر کرے، اور وہ اس کے ذکر کردہ لازم کا انکار نہ کرے بلکہ اس کا اثبات والتزام کرے۔

مثلاً: وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ کا انکار کرتا ہے، اگر وہ اس شخص سے کہ جو صفاتِ فعلیہ کا اثبات کرتا ہے کہے: تمہارے اللہ تعالیٰ کیلئے صفاتِ فعلیہ ثابت کرنے سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ افعال حادث (نئے) ہیں، تو ثابت کرنے والا کہے: میں اس لازم کا قائل ہوں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ تھا اور ہمیشہ رہے گا (اس کام کا خوب کرنے والا جس کا ارادہ کرے) اور اسکے اقوال وافعال کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ بدلیل قولہ اللہ تعالیٰ:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا﴾ (الکھف:۱۰۹)

---

[1] دلالتِ مطابقی: یہ ہے کہ لفظ اپنے تمام موضوع پر دلالت کرے، جیسے انسان کی دلالت، حیوان اور ناطق دونوں کے مجموعہ پر۔ دلالتِ تضمنی: یہ ہے کہ لفظ اپنے موضوع کے جز پر دلالت کرتا ہے، جیسے انسان کی دلالت، صرف حیوان پر یا صرف ناطق پر۔

دلالتِ التزامی: یہ ہے کہ لفظ نہ تو اپنے پورے موضوع پر دلالت کرتا ہے، اور نہ ہی اپنے موضوع کے جز پر دلالت کرتا ہے، بلکہ دلالت کرتا ہے ایسے خارج معنی پر جو موضوع کیلئے لازم ہو اور ذہن کو بھی منتقل کرتا ہو، اس خارجی معنی کی طرف موضوع کو چھوڑ کر، جیسے انسان کی دلالت قابلیتِ علم پر اور کتابت کی صنعت پر۔

ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کیلئے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے پروردگار کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجائے گا، گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں)

وقولہ تعالیٰ: ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّانَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللهِ اِنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (لقمان:۲۷)

ترجمہ: (روئے زمین کے (تمام) درختوں کی اگر قلمیں بن جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور انکے بعد سات سمندر اور ہوں تا ہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوسکتے، بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور باحکمت ہے)

جب یہ بات طے ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے افعال واقوال ہمیشہ سے ہیں اور رہیں گے تو پھر ان افعال میں سے کسی فعل کا نیا ہونا، اس کے حق میں نقص کو مستلزم نہیں ہوسکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے بیان کردہ لازم کا ذکر کرے اور اس لازم کو ممتنع قرار دے۔

مثلاً: صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر اگر اس شخص سے کہ جو صفاتِ باری تعالیٰ کو ثابت کرتا ہے کہے کہ تمہارے اثباتِ صفات سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں مخلوق کے مشابہ ہے، تو صفات کا اثبات کرنے والا اسے یوں جواب دے: کوئی مشابہت لازم نہیں آتی؛ کیونکہ خالق کی صفات اس کی طرف منسوب ہوکر ذکر ہوتی ہیں، مطلقاً ذکر نہیں ہوتیں کہ تیرا پیش کردہ لازم ممکن ہوسکے، جب اس کی صفات اس کی طرف نسبت کرکے ذکر ہوتی ہیں تو پھر وہ صفات اس کے ساتھ مختص ہیں اور ایسی مختص ہیں جیسی اس ذاتِ بے مثل کے لائق ہیں۔ پھر اے صفات کی نفی کرنے والے تو بھی تو اللہ تعالیٰ کیلئے ذات ثابت کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس کی ذات مخلوق کی ذات کے مشابہ نہیں ہوسکتی (اور یہ درست ہے) مگر یہ بات صفات کے بارہ میں کیوں نہیں کہہ

لیتے؟ بھلاپروردگار کی ذات اور صفات میں کیا فرق ہے؟

مذکورہ دونوں حالتوں میں لازم کا حکم بالکل واضح اور ظاہر ہے (پہلی صورت میں درست اور دوسری صورت میں ممتنع ہے)

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ لازم قول کے بارہ میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہو۔ چنانچہ نہ تو اس کا بصورتِ التزام ذکر ہو نہ بصورتِ منع۔ دریں حالت اس لازم کا حکم یہ ہے کہ اسے اس کے قائل کی طرف منسوب نہ کیا جائے؛ کیونکہ جب وہ اس کے سامنے ذکر کرے گا تو ممکن ہے وہ اس لازم کے ساتھ التزام قائم رکھے اور ممکن ہے ممتنع قرار دے دے...... دریں صورت یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قول ہی سے رجوع کرلے، یوں وہ لازم فاسد قرار پائے گا، اور لازم کا فساد، ملزوم کے فاسد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ان دونوں احتمالوں کے وارد ہونے کی وجہ سے یہ حکم ممکن نہ رہا کہ قول کا لازم بھی قول ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال اٹھائے کہ یہ لازم تو اس کے قول کا لازم تھا، لہذا اس کے قول کی طرح ضروری ہے کہ اس کے قول کا لازم بھی اس کا قول ہو؟

ہم اس کا جواب اس طرح دیں گے کہ یہ سوال مردود ہے۔ کیونکہ انسان ایک بشر ہے اور اس کے کچھ ذاتی وخارجی حالات ہوتے ہیں جو بعض اوقات اس لازم سے ذھول وغفلت کے پیدا ہونے کا سبب بن جاتے ہیں، پھر امکانِ سھو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات فکر کی بندش اس لازم سے غفلت کا سبب بن سکتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مناظرے کی کسی مشکل صورتِ حال میں لازم کے بارہ میں سوچے سمجھے بغیر بات کہہ گیا ہو، وغیرہ وغیرہ۔

پانچواں قاعدہ

﴿ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء توقیفی ہیں اور ان میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں ہے...... ﴾

اس قاعدہ کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء سے آگاہی واطلاع کیلئے کتاب

وسنت پر اکتفاء کیا جائے ،اوراس سلسلہ میں کتاب وسنت سے جو کچھ ثابت ہے صرف اسے ہی قبول کیا جائے اوراس میں کسی قسم کی کوئی کمی وبیشی نہ کی جائے ؛ کیونکہ عقلِ انسانی کیلئے ممکن ہی نہیں کہ وہ اس امر کا ادراک کر سکے کہ اللہ تعالیٰ کن ناموں کا مستحق ہے؟لہذا نص (کتاب وسنت کی دلیل) پراکتفاء کرنا ضروری ٹھہرا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾(الاسراء:۳۶)

ترجمہ:(جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہواس کے پیچھے مت پڑ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہرایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے)

ایک اورمقام پرفرمایا:﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَّأَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾(الاعراف:۳۳)

ترجمہ:(آپ فرمایئے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ کے ذمہ ایسی بات لگادو جس کو تم جانتے نہیں)

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایسا نام رکھنا جواس نے اپنی ذاتِ مبارکہ کیلئے پسند نہیں فرمایا، یااس کے رکھے ہوئے کسی نام کا انکار کردینا۔اس کے حق میں بہت بڑا ظلم ہے۔لہذا اس سلسلہ میں ادب کا پہلو اختیار کرنا اور کتاب وسنت کی دلیل پر اقتصار واکتفاء ضروری ہے۔

چھٹا قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کے نام کسی مخصوص ومعین تعداد میں محصور نہیں ہیں﴾

کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:[أسألك بكل اسم هولك سميت به

نفسک أو أنزلته فی کتابک أوعلمته أحدامن خلقک أو استأثرت به فی علم الغیب عندک]

ترجمہ:[اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہرنام کے واسطے سے دعا کرتا ہوں وہ نام جوتو نے اپنی ذات کے رکھے، یا وہ نام جوتو نے اپنی کتاب میں اتارے، یا وہ نام جوتو نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کوسکھا دیئے، یا وہ نام جوتو نے اب تک اپنے خزانہ غیب میں محفوظ فرما رکھے ہیں......] اس حدیث کواحمد، ابنِ حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام اس کے خزانۂ غیب میں محفوظ ہیں اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب میں ہو اس کا حصر واحاطہ کسی کیلئے ممکن نہیں ہے۔ نبی ﷺ کی یہ حدیث

[ان للہ تسعة وتسعین اسماً مائة الا واحدامن احصاھا ''دخل الجنة'']

ترجمہ:[بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، ایک کم سو، جوانہیں کما حقہ پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا] (صحیح بخاری مع الفتح (۲۱۸/۱۱) صحیح مسلم مع المفہم (۱۴/۷)

اس حدیث کا یہ مدلول بالکل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اس تعداد (۹۹) میں محصور ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حدیث کی عبارت یوں ہوتی: [اللہ تعالیٰ کے کل نام (۹۹) ہیں جوانہیں پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوگا] جبکہ حدیث کے الفاظ اس طرح نہیں وارد ہوئے، بلکہ حدیث کے الفاظ کو دیکھتے ہوئے معنی اس طرح ہوتا ہے۔

''اللہ تعالیٰ کے ناموں کی اس تعداد (۹۹) کی شان یہ ہے کہ جوانہیں پڑھنے کا حق ادا کرے گا وہ جنت میں جائے گا'' اس مفہوم کے مطابق حدیث کے الفاظ [من أحصاھا دخل الجنة] مستقل جملہ نہیں، بلکہ سابقہ جملے کی تکمیل ہے۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ آپ کہیں: میرے پاس سو درھم ہیں جو میں نے صدقہ کیلئے رکھے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کے پاس اور درھم نہیں ہیں جو آپ نے صدقہ کیلئے

نہیں رکھے۔

واضح ہو کہ ان ناموں کی تعیین کے سلسلہ میں نبی ﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہے...... اور جو حدیث بسلسلۂ تعیین پیش کی جاتی ہے وہ ضعیف ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ (۳۸۲/۹) میں فرماتے ہیں:

''اھل الحدیث کا اتفاق ہے کہ (۹۹) ناموں کی تعیین کے سلسلہ میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ نبی ﷺ کے قول سے نہیں ہے''

شیخ الاسلام ص (۳۷۹) پر مزید فرماتے ہیں:

''یہ نام ولید نامی راوی نے اپنے بعض شامی شیوخ سے ذکر کیئے ہیں، جیسا کہ بعض طرقِ حدیث میں یہ واضح طور پر آیا ہے''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۲۱۵/۱۱، طبع سلفیہ) میں فرمایا ہے:

''اس حدیث کے ضعف کے سلسلہ میں علت صرف ولید کا تفرد نہیں ہے، بلکہ نقلِ متن میں اختلاف، اضطراب، تدلیس اور احتمالِ ادراج یہ ساری علتیں ہوسکتی ہیں''

اب چونکہ ان (۹۹) ناموں کی تعیین نبی ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے، لہذا اسلف صالحین سے اس تعیین کے سلسلہ میں خاصہ اختلاف منقول ہے اور بہت سے اقوال وارد ہیں۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے (۹۹) نام جو مجھ پر ظاہر ہوئے انہیں جمع کرکے آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں:

قرآن مجید میں سے:

(۱) اللہ (اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی ہے) (۲) الأحد (ایک، اکیلا)

(۳) الأعلیٰ (سب سے بلند) (۴) الأکرم (سب سے زیادہ عزت والا)

(۵) الالٰہ (معبود) (۶) الأول (سب سے پہلے)

(۷) الآخر (سب کے بعد) (۸) الظاھر (سب سے ظاہر)
(۹) الباطن (سب سے پوشیدہ) (۱۰) الباریٔ (پیدا کرنے والا)
(۱۱) البر (نیکی و بھلائی کرنے والا) (۱۲) البصیر (دیکھنے والا)
(۱۳) التواب (توبہ کرنے والا) (۱۴) الجبار (ملانے والا)
(۱۵) الحافظ (نگہبان) (۱۶) الحسیب (حساب لینے والا)
(۱۷) الحفیظ (سنبھالنے والا) (۱۸) الحفی (مہربانی کرنے والا)
(۱۹) الحق (سچا اور ثابت) (۲۰) المبین (ظاہر کرنے والا)
(۲۱) الحکیم (حکمت والا، دانا) (۲۲) الحلیم (بردبار)
(۲۳) الحمید (تعریف کیا ہوا) (۲۴) الحی (زندہ)
(۲۵) القیوم (ہمیشہ قائم) (۲۶) الخبیر (خبردار)
(۲۷) الخالق (پیدا کرنے والا) (۲۸) الخلاق (پیدا کرنے والا)
(۲۹) الرء وف (شفقت کرنے والا) (۳۰) الرحمن (مہربان)
(۳۱) الرحیم (رحم کرنے والا) (۳۲) الرزاق (روزی دینے والا)
(۳۳) الرقیب (نگہبان) (۳۴) السلام (سلامتی والا)
(۳۵) السمیع (سننے والا) (۳۶) الشاکر (قدردان)
(۳۷) الشکور (قدردان، تھوڑی سی محنت پر بہت زیادہ اجر دینے والا)
(۳۸) الشھید (گواہ)
(۳۹) الصمد (بے نیاز، داتا) (۴۰) العالم (جاننے والا)
(۴۱) العزیز (غالب) (۴۲) العظیم (سب سے بڑا)
(۴۳) العفو (معاف کرنے والا) (۴۴) العلیم (جاننے والا)

(۴۵) العلی (بلند)
(۴۶) الغفار (ڈھانپنے والا، بخشنے والا)
(۴۷) الغفور (بخشنے والا)
(۴۸) الغنی (بے پروا)
(۴۹) الفتاح (کھولنے والا)
(۵۰) القادر (قدرت رکھنے والا)
(۵۱) القاہر (غالب زبردست)
(۵۲) القدوس (پاک)
(۵۳) القدیر (قدرت والا)
(۵۴) القریب (نزدیک)
(۵۵) القوی (طاقت ور)
(۵۶) القہار (زبردست)
(۵۷) الکبیر (سب سے بڑا)
(۵۸) الکریم (بڑا بزرگ اور سخی)
(۵۹) اللطیف (نرمی کرنے والا)
(۶۰) المؤمن (امن دینے والا)
(۶۱) المتعالی (انتہائی بلند)
(۶۲) المتکبر (بڑائی کرنے والا)
(۶۳) المتین (زبردست، قوت والا)
(۶۴) المجیب (دعا قبول کرنے والا)
(۶۵) المجید (بزرگی والا)
(۶۶) المحیط (احاطہ کرنے والا)
(۶۷) المصور (صورت عطا کرنے والا)
(۶۸) المقتدر (مکمل قدرت رکھنے والا)
(۶۹) المقیت (روزی دینے والا)
(۷۰) الملک (بادشاہ)
(۷۱) الملیک (بادشاہ)
(۷۲) المولی (مالک، آقا)
(۷۳) المہیمن (نگہبان اور محافظ)
(۷۴) النصیر (مدد کرنے والا)
(۷۵) الواحد (یکتا و یگانہ، اکیلا)
(۷۶) الوارث (حقیقی وارث ہونے والا)
(۷۷) الواسع (کشادہ اور وسیع)
(۷۸) الودود (دوست، بھلائی چاہنے والا)
(۷۹) الوکیل (کارساز)
(۸۰) الولی (دوست مددگار)
(۸۱) الوہاب (بہت زیادہ دینے والا)

احادیثِ رسول سے

(۸۲) الجمیل (خوبصورت)	(۸۳) الجواد (بہت زیادہ سخی)
(۸۴) الحکم (فیصلہ کرنے والا)	(۸۵) الحی (زندہ)
(۸۶) الرب (پالنے والا)	(۸۷) الرفیق (دوست)
(۸۸) السبوح (پاک)	(۸۹) السید (مالک)
(۹۰) الشافی (شفاء دینے والا)	(۹۱) الطیب (پاک)
(۹۲) القابض (تنگی کرنے والا)	(۹۳) الباسط (کشادگی کرنے والا)
(۹۴) المتقدم (آگے کرنے والا)	(۹۵) المؤخر (پیچھے کرنے والا)
(۹۶) المحسن (احسان کرنے والا)	(۹۷) المعطی (عطا کرنے والا)
(۹۸) المنان (احسان کرنے والا)	(۹۹) الوتر (ایک)

بڑی تلاش اور جستجو کے بعد اللہ تعالیٰ کے یہ مبارک نام منتخب کیئے ہیں۔ ان میں سے (۸۱) نام قرآن مجید سے، جبکہ (۱۸) سنتِ رسول ﷺ سے حاصل ہوئے ہیں۔

البتہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے ان ناموں میں ''الحفي'' کو شامل کرنے میں کچھ تأمل ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید میں مقیداً وارد ہوا ہے ﴿إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا﴾ (مریم:۴۸) اسی طرح ''المحسن'' کو اسماء حسنی میں داخل کرنے میں بھی کچھ تردد ہے، کیونکہ طبرانی کی جس روایت میں اس کا ذکر ہے ہم اس کے رجال پر مطلع نہیں ہو سکے، اسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسماء حسنٰی میں ذکر کیا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام اضافت کے ساتھ بھی وارد ہوئے ہیں، مثلاً: ''مالک الملک'' ''ذوالجلال والاکرام''

ساتواں قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد﴾

الحاد سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں پر ایمان لانے سے متعلق جو واجب اور ضروری

امور ہیں ان میں سے کسی امر سے انحراف کرنا، اس الحاد کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نام کا انکار کردیا جائے یا وہ نام جن صفات واحکام پر دلالت کررہے ہیں ان کا انکار کردیا جائے۔ گمراہ فرقہ جہمیہ اس الحاد کا مرتکب تھا، ضروری تو یہ تھا کہ ان ناموں پر وجوباً ایمان لایا جاتا، نیز یہ نام جن احکام اور صفاتِ لائقہ پر مشتمل ہیں ان پر ایمان لایا جاتا، لیکن اس گمراہ فرقے نے انکار کرکے اس الحاد اور انحراف کا ارتکاب کیا۔

(۲) الحاد کی دوسری شکل یہ ہے کہ ان ناموں کی مدلول صفاتِ باری تعالیٰ کو مخلوقات کی صفات کے مشابہ قرار دیا جائے، حالانکہ یہ تشبہ باطل ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ نصوصِ قرآن وحدیث، اس تشبیہ پر دلالت کریں، بلکہ نصوص تو ہر قسم کی تشبیہ کے باطل ہونے پر دال ہیں، تو جو یہ تشبیہ کا نظریہ اپنائے گا اس نے اسماءِ حسنیٰ میں الحاد وانحراف کا ارتکاب کیا۔

(۳) الحاد کی تیسری شکل یہ ہے کہ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام رکھے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے ذکر نہیں فرمایا، جیسا کہ نصاریٰ نے ذاتِ باری تعالیٰ کو ''الأب'' یعنی باپ کا نام دیا۔ فلاسفہ نے ''العلة الفاعلة'' کا نام دیا۔ یہ سب الحاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں لہذا اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام تجویز کرنے والا الحاد وانحراف کا مرتکب قرار پائے گا...... نیز ان گمراہ فرقوں نے اللہ تعالیٰ کے جو نام رکھے ہیں وہ سب کے سب فی نفسہ باطل ہیں ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان ناموں سے تنزیہ وپاکیزگی بیان کی جائے۔

(۴) الحاد کی چوتھی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں سے اپنے معبودوں کے نام اشتقاق کرنا۔ اس الحاد کے مرتکب مشرکینِ مکہ تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام ''العزیز'' سے اشتقاق کرتے ہوئے اپنے ایک معبود کا نام ''العزیٰ'' رکھ دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ''الالٰـہ'' سے اشتقاق کرتے ہوئے اپنے ایک معبود کا نام ''اللات'' رکھ دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کے ساتھ مختص ہیں، چنانچہ اس کا فرمان ہے: ﴿اَللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَاءُ

الْحُسْنٰى﴾(طہ:۸)

ترجمہ:(وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بہترین نام اسی کے ہیں)

نیز فرمایا:﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾(الاعراف:۱۸۰)

ترجمہ:(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کیلئے ہیں۔سوان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو)

نیز فرمایا:﴿لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾

ترجمہ:(اس کیلئے (نہایت) اچھے نام ہیں، ہر چیز خواہ وہ آسمانوں میں ہو خواہ زمین میں وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے)(الحشر:۲۴)

اب جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی عبادت والوہیت کے ساتھ مختص ہے، نیز یہ بھی اس کا خاصہ ہے کہ آسمانوں اورزمینوں کی ہر چیز اس کی تسبیح بیان کرتی ہے، اسی طرح اس کے تمام اسماءِ حسنٰی اس کے ساتھ مختص ہیں اور اس حقیقت پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے روگردانی کرتے ہوئے کسی غیر کو وہ نام دینا الحاد وانحراف ہی قرار پائے گا۔

واضح ہو کہ یہ الحاد اپنی تمام اقسام کے ساتھ حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ملحدین کو اس انداز سے تہدید وتنبیہ فرمائی:

﴿وَذَرُوْا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ أَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

ترجمہ:(اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے کیئے کی ضرور سزا ملے گی)(الاعراف:(۱۸۰)

بلکہ اُدلہ شرعیہ کے بعض متقاضیات کے پیشِ نظر تو الحاد کی بعض صورتیں شرک یا کفر کے درجہ پر پہنچی ہوئی ہیں۔(والعیاذ باللہ)

﴿اللہ تعالیٰ کی صفات پرایمان لانے کے قواعد﴾

پہلا قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کی صفات، صفاتِ کاملہ ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے ﴾

اللہ تعالیٰ کی صفات، صفاتِ کاملہ ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے، مثلاً: صفتِ ''الحیاۃ'' ''العلم'' ''القدرۃ'' ''السمع'' ''البصر'' ''الرحمۃ'' ''العزۃ'' ''الحکمۃ'' ''العلو'' یعنی بلند ہونا۔ ''العظمۃ'' وغیرہ

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے صفاتِ کمال ہونے پر قرآن وحدیث، عقل اور فطرت سب دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِالآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (النحل:٦٠)

ترجمہ: (آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کی ہی بُری مثال ہے، اللہ تعالیٰ کیلئے تو بہت بلند صفت ہے، وہ بڑا ہی غالب اور باحکمت ہے)

تو اللہ تعالیٰ کیلئے المثل الاعلیٰ ہے جس سے مراد سب سے اعلیٰ واکمل وصف ہے۔

عقل کی دلالت اس طرح ہے کہ تمام موجودات کا وجود حقیقت ہے، لہذا یقینی طور پر ہر موجود کی کچھ صفات ہونگی اب وہ صفات یا تو کمال ہیں یا نقص کے ساتھ ہیں...... اللہ تعالیٰ کی صفات کا صفاتِ نقص ہونا باطل ہے؛ کیونکہ (جس ذات کی وہ صفات ہیں) وہ ذات رب کامل ہے جو تمام عبادات کا مستحق ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کے معبود ہونے کا ابطال اس دلیل سے کیا کہ تمام کے تمام عجز ونقص کے ساتھ متصف ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّايَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُوْنَ﴾ (الاحقاف:٥)

ترجمہ: (اوراس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا؟ جواللہ تعالی کے سواایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کرسکیں بلکہ انکے پکارنے سے محض بے خبر ہوں)

نیز فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَايَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ . أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ (النحل: ۲۰،۲۱)

ترجمہ: (اور جن جن کو یہ لوگ اللہ تعالی کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے، بلکہ وہ خود پیدا کیئے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں، انہیں تو یہ بھی شعور نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے)

نیز اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ابراھیم علیہ السلام کا قول پیش کیا جو اپنے باپ پر اس طرح حجت قائم فرمارہے ہیں:

﴿يَاأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَايَسْمَعُ وَلَايُبْصِرُ وَلَايُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا﴾ (مریم: ۴۲)

ترجمہ: (اے ابا! آپ ان کی پوجا پاٹ کیوں کررہے ہیں جو نہ سنیں نہ دیکھیں؟ نہ آپ کو کچھ فائدہ پہنچاسکیں)

نیز اپنی قوم پر اس طرح حجت قائم فرمارہے ہیں: ﴿أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَايَضُرُّكُمْ . أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾

ترجمہ: (کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ بھی نفع پہنچاسکیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ تعالی کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تمہیں اتنی سے بھی عقل نہیں)(الانبیاء: ٦٦،٦٧)

پھر حس اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مخلوق کی بھی کچھ صفات، صفاتِ کمال ہیں، جو کہ اللہ تعالی کی دَین اور عطا ہے تو کمال عطا فرمانے والی ذات خود بالاولی کمال کی مستحق اور اس کے ساتھ متصف ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے صفاتِ کمال ہونے پر فطرت کی دلالت بھی موجود ہے، اور وہ اس طرح کہ فطرتِ سلیمہ فطری اور جبلی طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت، تعظیم اور عبادت پر قائم ہے.....تو پھر یہ جبلت اور فطرت اسی ذات کیلئے محبت، تعظیم اور عبادت بجالائے گی جس کے بارہ میں اسے یقین ہو کہ وہ صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے، اور وہ صفات ایسی ہیں جو اس کی ربوبیت اور الوہیت کے لائق ہیں۔

جو صفت، صفتِ نقص ہوگی اور کمال سے خالی ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہوگی، مثلاً: موت، جہل، نسیان، عاجزی، اندھاپن، بہراپن وغیرہ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَايَمُوْتُ﴾ (الفرقان:۵۸)

ترجمہ: (اس ہمیشہ زندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں جسے کبھی موت نہیں)

اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا: ﴿فِيْ كِتَابٍ لَايَضِلُّ رَبِّيْ وَلَايَنْسٰى﴾

ترجمہ: (ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں موجود ہے، نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے) (طٰہٰ:۵۲)

نیز فرمایا: ﴿وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَافِي الْاَرْضِ﴾ (الفاطر:۴۴)

ترجمہ: (اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اسے ہرادے نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں)

نیز فرمایا: ﴿أَمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (الزخرف:۸۰)

ترجمہ: (کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے (یقیناً وہ برابر سن رہے ہیں) بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے دجال کے ذکر میں فرمایا: [انه أعور وان ربكم ليس بأعور]

ترجمہ:(بے شک دجال کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں)]

نیز فرمایا:[أیها الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لاتدعون أصم ولا غائبا]

ترجمہ:[اے لوگو! پرسکون رہو، تم کسی ایسی ذات کو نہیں پکار رہے جو بہری ہے اور نہ ہی ایسی ذات کو جو غائب ہے]

اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو شدید عذاب سے دوچار کرنے کی وعید سنائی جو اللہ تعالیٰ کو کسی صفتِ نقص سے موصوف کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ﴾(المائدۃ:٦٤)

ترجمہ:(اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کے اس قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے)

نیز فرمایا:﴿لَقَدْ سَمِعَ اللهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَاقَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾(آل عمران:١٨١)

ترجمہ:(یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول بھی سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم تونگر ہیں ان کے اس قول کو ہم لکھ لیں گے۔ اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی، اور ہم ان سے کہیں گے کہ جلنے والے عذاب چکھو!)

اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی باتوں سے کہ جو اللہ تعالیٰ کو نقائص سے متصف کرتے ہیں اپنی تنزیہ اور پاکیزگی بیان فرمائی ہے۔

چنانچہ فرمایا:﴿ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ . وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾(الصافات:١٨٠تا١٨٢)

ترجمہ:(پاک ہے آپ کا رب جو بہت بڑی عزت والا ہے ہر اس چیز سے (جو مشرک) بیان

کرتے ہیں۔پیغمبروں پر سلام ہے۔اور سب طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو سارے جہان کا رب ہے)

نیز فرمایا: ﴿ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ (المؤمنون:۹۱)

ترجمہ: (نہ تو اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے، ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو لیے لیے پھرتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ جو اوصاف یہ بتلاتے ہیں اللہ ان سے پاک (اور بے نیاز) ہے)

واضح ہو کہ کوئی ایسی صفت جو بعض حالات میں صفتِ کمال ہو، اور بعض حالات میں صفتِ نقص ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مطلق جائز ہوگی، اور نہ ہی مطلق ممتنع ہوگی۔ چنانچہ نہ تو اس کا اللہ تعالیٰ کے حق میں مطلقاً اثبات جائز ہے، اور نہ ہی اسکی اس سے مطلق نفی جائز ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں تفصیل اختیار کرنی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ وہ صفت جس صورت میں صفتِ کمال ہوگی اس صورت میں اسے اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرنا جائز ہوگا اور جس صورت میں وہ صفتِ نقص ہوگی اس صورت میں اس کا اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات ممتنع ہوگا۔ مثلاً: صفتِ مکر، کید، اور خداع (دھوکہ) وغیرہ۔ یہ صفات اس وقت صفاتِ کمال قرار پائیں گی اور اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کی جائیں گی جب ان کا استعمال مقابلۃً ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب یہ صفات ان لوگوں کے مقابلے میں ذکر ہوں جو اس قسم کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے روا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں (مثلاً: وہ اللہ تعالیٰ سے مکر، کید یا خداع کا معاملہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی انکے ساتھ مکر، کید یا خداع کا معاملہ فرماتا ہے) یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے، بلکہ اپنے دشمنوں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ بلکہ اس سے بھی سخت کرنے پر قادر ہے جیسا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور یہ صفات (مکر، خداع وغیرہ) اگر بصورتِ مقابلہ مذکور نہ ہوں تو پھر یہ صفاتِ نقص ہونگی،

جن کا اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات ناجائز ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کو اپنے لیئے علی سبیل الاطلاق ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ان لوگوں کے مقابلے میں ذکر فرمایا جو اس کے یا اس کے رسولوں کے ساتھ اس نوع کا معاملہ روا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل آیاتِ کریمہ ملاحظہ ہوں:

﴿وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللہُ وَاللہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ﴾ (الانفال:۳۰)

ترجمہ: (وہ تو اپنی تدبیریں کررہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کررہا تھا اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے)

﴿إِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا . وَأَکِیْدُ کَیْدًا﴾ (الطارق:۱۵،۱۶)

ترجمہ: (البتہ کافر داؤ گھات میں ہیں۔ اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں)

﴿وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِآیَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ . وَأُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾ (الاعراف:۱۸۲،۱۸۳)

ترجمہ: (اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بتدریج لیئے جارہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں۔ اور ان کو مہلت دیتا ہوں بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے)

﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ یُخَادِعُوْنَ اللہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ﴾ (النساء:۱۴۲)

ترجمہ: (بے شک منافق اللہ تعالیٰ سے چالبازیاں کررہے ہیں اور وہ انہیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے)

﴿قَالُوْا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِئُوْنَ . اَللہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ﴾ (البقرۃ:۱۴،۱۵)

ترجمہ: (کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے)

واضح ہو کہ ایک صفت (خیانت) ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے

ساتھ خیانت کا معاملہ کرے گا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرتے ہیں، بلکہ یوں فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرتے ہیں اللہ انہیں پکڑے گا۔

ملاحظہ ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (الانفال:۷۱)

ترجمہ: (اور اگر وہ تجھ سے خیانت کا خیال کریں گے تو یہ اس سے پہلے خود اللہ کی خیانت کر چکے ہیں آخر اس نے انہیں گرفتار کرا دیا، اور اللہ تعالیٰ علم وحکمت والا ہے)

اس لیئے کہ صفتِ خیانت ہمیشہ صفتِ نقص ومذمت ہی رہے گی؛ کیونکہ خیانت سے مراد مقامِ امانت میں دھوکہ کرنا ہے۔ یہ صفتِ مذمت ہے جس کا کسی بھی صورت اللہ تعالیٰ کیلئے اطلاق واستعمال جائز نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض عامۃ الناس کا یوں کہنا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ خیانت کا معاملہ فرماتا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں، محض باطل، قابلِ انکار، اور صریح غلط ہے۔ اس سے رکنا اور روکنا واجب ہے۔

دوسرا قاعدہ

صفاتِ باری تعالیٰ کے سلسلہ میں دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا دائرہ، اللہ تعالیٰ کے اسماء کے دائرے سے وسیع ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر نام کسی صفت کے ضمن پر مشتمل ہوتا ہے جیسا کہ اسماء کے سلسلہ میں قاعدہ نمبر (۲) میں بیان ہو چکا۔

اسکے علاوہ بھی بہت سی صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے افعال سے متعلق ہیں اور اس کے افعال کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ اسی طرح اسکے اقوال کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہے (لہذا صفات کا باب اسماء کے باب سے کہیں زیادہ وسیع ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ

مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللهِ اِنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾(لقمان:۲۷)

ترجمہ:(روئے زمین کے (تمام) درختوں کی اگر قلمیں ہوجائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہواور انکے بعد سات سمندر اور ہوں تا ہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوسکتے، بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور باحکمت ہے)

اورمثال کےطور پراللہ تعالیٰ کی صفت ''المجیٔ''اور''الإ تیان''جوآنے کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔اسی طرح صفتِ''الأخذ'' و''الإمساک''و''البطش''جوپکڑنے کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ثابت ہیں اور اس جیسی اور اتنی صفات ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا...... یہ صفات قرآن وحدیث میں ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَجَاءَ رَبُّکَ﴾(الفجر:۲۲) ترجمہ(تیرارب خودآجائے گا)

اورفرمایا:﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾(البقرۃ:۲۱۰)

ترجمہ:(کیالوگوں کواس بات کاانتظار ہے کہ ان کے پاس خوداللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں آجائے)

اورفرمایا:﴿فَأَخَذَهُمُ اللهُ بِذُنُوْبِهِمْ﴾(الانفال:۵۲)

ترجمہ:(اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث انہیں پکڑلیا)

اورفرمایا:﴿ وَيُمْسِکُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِه﴾(الحج:۶۵)

ترجمہ:(وہی آسمان کوتھامے ہوئے ہے کہ زمین پراس کی اجازت کے بغیر گرنہ پڑے)

اورفرمایا:﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِيْدٌ﴾(البروج:۱۲)

ترجمہ:(یقیناً تیرے رب کی پکڑبڑی سخت ہے)

اورفرمایا:﴿يُرِيْدُ اللهُ بِکُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾(البقرۃ:۱۸۵)

ترجمہ:(اللہ تعالیٰ کاارادہ تمہارے ساتھ آسانی کاہے،سختی کانہیں)

اور نبی ﷺ نے فرمایا:[وینزل ربنا الی السماء الدنیا](متفق علیہ)

ترجمہ:[اور ہمارا رب آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے]

ہم ان تمام صفات کو، جس طرح کہ وارد ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرتے ہیں، لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کے نام نہیں بناتے۔ چنانچہ ان صفات کو سامنے رکھ کے یہ کہنا ناجائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام "الجائی" یا "الآتی" یا "الآخذ" یا "الممسک" یا "الباطش" یا "المرید" یا "النازل" ہیں۔ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی جاسکتی ہیں، اوران تمام افعال کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جاسکتی ہے۔

تیسرا قاعدہ

﴿صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: ثبوتیہ اور سلبیہ۔﴾

صفاتِ ثبوتیہ وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یا اپنے رسول ﷺ کی زبان سے بیان فرمادیا۔ یہ تمام صفات، صفاتِ کمال ہیں، جن میں کسی طرح کا کوئی نقص نہیں ہے جیسے: "الحیاۃ" "العلم" "القدرۃ" "الاستواء علی العرش" "النزول الی السماء" (یعنی: آسمان کی طرف نزول فرمانا) "الوجہ" (یعنی: چہرہ) اور "الیدین" (یعنی: دو ہاتھ) وغیرہ۔

ان صفات کو اللہ تعالیٰ کیلئے حقیقۃً ثابت کرنا واجب ہے، ایسی صورت وکیفیت کے ساتھ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لائق ہے، اوراس پر نقلی وعقلی دلیل موجود ہے۔

نقلی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ یٰـاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللهِ وَمَلَا ئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًا ﴾(النساء:۱۳۶)

ترجمہ:(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسول ﷺ پر اور اسکی کتاب پر جو اس نے

اپنے رسول ﷺ پر اتاری ہے اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے اس نے نازل فرمائی ہیں، ایمان لاؤ! جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اسکے فرشتوں سے اور اسکی کتابوں سے اور اسکے رسولوں سے اور قیامت کے دن سے کفر کرے وہ تو بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا گرا)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم ہے، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی تمام صفات پر ایمان لانے کو متضمن و مشتمل ہے۔ نیز کتاب، جو کہ رسول پر نازل ہوئی، پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات پر ایمان لانے کو متضمن ہے جو اس کتاب میں بیان ہوئیں۔

اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے ضمن میں ہر اس چیز کو قبول کرنا آئیگا جو آپ ﷺ نے اپنے بھیجنے والے کے بارہ میں بتائی، اور وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ان تمام صفات سے متصف ہونے کی خبر دی، اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اور سب سے سچی اور سب سے خوبصورت بات کہنے والا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے بارہ میں جو بھی خبر دی، اس کا بلاتردد اقرار واثبات واجب ہے؛ کیونکہ کسی بھی خبر میں تردد تو اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ خبر ایسے شخص سے صادر ہو جس کا جاہل ہونا یا جھوٹا ہونا ممکن ہو، یا پھر وہ ایسا عاجز ہو کہ اسے اپنے مافی الضمیر کو صحیح طریقے سے بیان کرنے پر قدرت نہ ہو، اور یہ تینوں عیب اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع ومحال ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ کی ہر خبر قبول کرنا واجب ہے۔

اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے متعلق جو بھی خبر دی اسے بعینہ اسی طرح قبول کرنا واجب ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ اپنے پروردگار کو جاننے والے، سب سے زیادہ سچی خبر دینے والے، سب سے بڑھ کر خیر خواہی کے جذبات رکھنے والے اور سب سے بڑے فصیح البیان تھے۔

صفاتِ سلبیہ، وہ صفات ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے نفی فرمادی، اس نفی کا ذکر

کتاب اللہ میں یا سنتِ رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔ یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کے حق میں صفاتِ نقص ہیں، مثلاً: موت، نیند، جہل، نسیان، عجز، تعب (تھکاوٹ) وغیرہ۔

ان تمام صفات کی اللہ تعالیٰ سے نفی کرنا ضروری ہے اور وہ اس طرح کہ جو ان کی ضد ہے، ان کا اللہ تعالیٰ کیلئے کامل واکمل طریقہ سے ثابت ہونے کا ایمان رکھا جائے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے جس صفت کی نفی فرمائی، اس سے مراد اس صفت کے منتفی ہونے کا بیان ہے، اس لیئے کہ اس صفت کی ضد اللہ تعالیٰ کیلئے بطریق کامل ثابت ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے اگر کسی صفت کی نفی فرمائی تو اس سے مجرد نفی مراد نہیں ہے؛ کیونکہ کسی صفت کی خالی نفی کر دینا کمال نہیں ہے، کمال تب ہوگا جب اس نفی کے ضمن میں ایسی حقیقت ہو جو کمال پر دلالت کر رہی ہو...... مجرد نفی تو عدم ہے اور عدم تو لاشی ہے چہ جائیکہ کسی کمال پر قائم ہو، پھر بعض اوقات کسی سے کسی صفت کی نفی اس لیئے بھی کیجاتی ہے کہ اس چیز میں اس صفت کے رکھنے کی قابلیت وصلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً: اگر آپ یوں کہیں: دیوار ظلم نہیں کرتی...... تو یہ نفی دیوار کیلئے کسی کمال کا باعث نہیں ہے۔ بعض اوقات کسی شخص سے کسی صفت کی نفی اس لیئے بھی کی جاتی ہے کہ وہ شخص اس صفت کے قائم رکھنے سے عاجز ہے، تو یہ اس شخص کے حق میں نقص ہوگا۔ جیسے کسی شاعر نے کہا:

قبیلتهم لایغدرون بذمة ولایظلمون الناس حبة خردل

ترجمہ: ان کا قبیلہ کسی عہد میں غدر نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں پر ایک رائی کے دانے کے برابر ظلم کرتا ہے۔

اس قبیلے سے غدر یا ظلم کی نفی اس لیئے کی کہ ان میں اتنی جرأت وہمت ہی نہیں کہ وہ یہ کام کر سکیں تو یہ نفی ان کے حق میں نقص ہی ظاہر کر رہی ہے نہ کہ ان کی تعریف۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لکن قومی وان کانوا ذوی عدد　　لیسوا من الشر فی شئ وان هانا

ترجمہ: لیکن میری قوم اگر چہ وہ تعداد میں اچھی خاصی ہے، مگر لڑنے میں کچھ بھی نہیں، خواہ لڑائی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ (یہاں بھی اس قوم سے لڑائی کی نفی ان کی تعریف پر دلالت نہیں کر رہی بلکہ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ ان میں لڑنے کی ہمت وطاقت ہی نہیں ہے۔ تو گویا یہ نفی ان کے حق میں نقص ہے جو ان کی کمزوری پر دلالت کر رہی ہے۔)

(بہرحال اللہ تعالیٰ سے کسی صفت کی نفی کا معنی تب ہی مکمل ہوگا جب اس منفی صفت کی ضد بطریقِ کمال اس کیلئے ثابت کی جائے)

اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ﴾

ترجمہ: (اس ہمیشہ زندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں جسے کبھی موت نہیں) (الفرقان: ۵۸)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ سے صفتِ موت کی نفی ہے لیکن اس طرح کہ اسکی ضد یعنی (حیات) اس ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کیلئے ثابت ہے..... تو موت کی نفی اس لیئے ہے کہ وہ کمالِ حیات کی صفت سے متصف ہے۔

ایک اور مثال: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ الکھف: ۴۹)

ترجمہ: (تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا)

یہاں تو اللہ تعالیٰ سے صفتِ ظلم کی نفی ہے، اور یہ نفی اس لیئے ہے کہ وہ ذات، ظلم کی ضد یعنی کمالِ عدل کی صفت سے متصف ہے۔

تیسری مثال: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ (الفاطر: ۴۴)

ترجمہ: (اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو ہرا دے نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں)

یہاں اللہ تعالیٰ سے صفتِ عجز کی نفی ہے، اس لیئے کہ وہ ذات عجز کی ضد یعنی کمالِ علم اور کمالِ

قدرت کی صفت سے متصف ہے۔

اس لیئے آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ﴾ (الفاطر:۴۴)

ترجمہ: (وہ بڑے علم والا بڑی قدرت والا ہے)

کیونکہ عجز کا سبب یا تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ اسبابِ ایجاد سے ناواقف ہوتا ہے یا اسباب سے تو آگاہ ہوتا ہے قدرتِ ایجادنہیں پاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ تو کمالِ علم اور اور کمالِ قدرت کی صفات سے متصف ہے، لہذا اسے آسمان وزمین کی کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی۔

چوتھا قاعدہ

﴿صفاتِ ثبوتیہ، صفاتِ مدح وکمال ہیں﴾

صفاتِ ثبوتیہ، صفاتِ مدح وکمال ہیں۔ یہ صفات جس قدر زیادہ ہوں گی اور ان کی دلالت میں جس قدر تنوع ہوگا اس قدر ان صفات کے موصوف کا کمال ظاہر ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارہ میں جن صفاتِ ثبوتیہ کی خبردی ہے وہ صفاتِ سلبیہ سے کہیں زیادہ ہیں، قرآن وحدیث کا علم رکھنے والوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے۔

صفاتِ ثبوتیہ کا ذکر تو جابجا ملتا ہے، مگر صفاتِ سلبیہ کا ذکر غالبًا مندرجہ ذیل احوال میں کیا جاتا ہے

(۱) جہاں اللہ تعالیٰ کے عمومِ کمال کا ذکر مقصود ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) ترجمہ: (اس جیسی کوئی چیز نہیں)

اور یہ فرمان: ﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص:۴)

ترجمہ: (نہ کوئی اسکا ہمسر ہے)

(۲) صفاتِ سلبیہ کے ذکر کا دوسرا مقام یہ ہے کہ جھوٹے لوگ اللہ تعالیٰ کے حق میں جو غلط باتیں منسوب کرتے ہیں ان کی نفی مقصود ہو...... جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۔ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴾

(مریم:۹۱،۹۲) ترجمہ:(کہ وہ رحمان کی اولاد ثابت کرنے بیٹھیں۔شانِ رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ اولا درکھے)

(۳) صفاتِ سلبیہ کے ذکر کا تیسرا مقام یہ ہے کہ کسی امرِ معین کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کے کمال میں کسی قسم کے نقص کا وہم پیدا ہورہا ہوتو اس وہم کے دفع وازالہ کیلئے صفتِ سلبیہ ذکر کی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ﴾ (الدخان:۳۸)

ترجمہ:(ہم نے زمین اور آسمان اور اس کے درمیان کی چیزوں کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَابَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ (ق:۳۸)

ترجمہ:(یقیناً ہم نے آسمان اور زمین اور جوکچھ اس کے درمیان ہے سب کو (صرف) چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں تھکان نے چھوا تک نہیں)

پانچواں قاعدہ

﴿اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ثبوتیہ کی دوقسمیں ہیں:

(۱) صفاتِ ذاتیہ (۲) صفات فعلیہ

صفات ذاتیہ :وہ صفات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متصف ہے،اور ہمیشہ متصف رہے گا۔جیسے"العلم، القدرة، السمع، البصر، العزة، الحکمة، العلو، العظمة "ان میں سے کچھ صفاتِ خبریہ ہیں،جیسے" الوجہ (چہرہ) الیدین (دوہاتھ) العینین (دوآنکھیں)"

صفات فعلیه :وہ صفات ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت وچاہت سے ہے۔

چاہے وہ کرے اور چاہے نہ کرے۔ مثلاً: ''عرش پر مستوی ہونا یا آسمانِ دنیا پر نزول فرمانا''

اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی ہیں جو ذاتی بھی ہوسکتی ہیں اور فعلی بھی، مثلاً: صفتِ کلام: یہ صفت باعتبارِ اصل صفتِ ذاتیہ ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے، اور ہمیشہ متکلم رہے گا، لیکن کسی کلام کے کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے یہ صفتِ فعلیہ ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا اس کی مشیئت کے تابع ہے، جب چاہے، جو چاہے کلام فرمالے (اس لحاظ سے صفتِ فعلیہ ہوئی) اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونَ﴾

ترجمہ: (وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہوجا، وہ اسی وقت ہوجاتی ہے) (یس: ۸۲)

اللہ تعالیٰ کی ہر وہ صفت جس کا تعلق اس کی مشیئت سے ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تابع ہے، یہ حکمت کبھی تو ہمیں معلوم ہوتی ہے، اور کبھی ہم اس کی معرفت وادراک سے عاجز ہوتے ہیں، البتہ کامل یقین کی حد تک یہ علم ضرور ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی مشیئت فرمانا اس کی حکمت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی نکتہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ (الانسان: ۳۰)

ترجمہ: (اور تم نہ چاہو گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے، بیشک اللہ تعالیٰ علم والا باحکمت ہے)

چھٹا قاعدہ

اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات کے سلسلہ میں دو انتہائی خطرناک اعتقادی گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔ (۱) تمثیل (۲) تکییف

تمثیل: سے مراد بندے کا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے جو صفات ثابت ہیں وہ مخلوقات کی صفات کے مماثل ہیں۔ یہ عقیدہ بدلیل نقل وعقل باطل ہے۔

نقلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

ترجمہ:(اس جیسی کوئی چیز نہیں)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾(النحل:١٧)

ترجمہ:(تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اس جیسا ہے جو پیدا نہیں کرسکتا؟ کیا تم بالکل نہیں سوچتے)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴾(مریم:٦٥)

ترجمہ:(کیا تیرے علم میں اس کا ہمنام ہم پلہ اور بھی ہے؟)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴾(الاخلاص:٤)

ترجمہ(اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے)

عقلی دلیل: عقلی دلیل کئی وجوہ سے ہے۔

پہلی وجہ: یہ کہ بداھۃً وضرورۃً یہ بات معلوم ہے کہ خالق ومخلوق کی ذات میں بڑا فرق اور تباین ہے......اور ذات کا یہ فرق صفات کے فرق کو مستلزم ہے۔کیونکہ صفت ہمیشہ اپنے موصوف کے لائقِ شان ہوتی ہے۔صفات کا یہ فرق مختلف الذات مخلوقات میں نمایاں نظر آتا ہے، چنانچہ ایک اونٹ کی قوت، ایک چیونٹی کی قوت سے مختلف ہے......تو جب مختلف مخلوقات صفات کے لحاظ آپس میں فرق رکھتی ہیں حالانکہ ممکن الوجود اور حادث ہونے میں سب مشترک ہیں تو پھر خالق اور مخلوق کی صفت میں پایا جانے والا فرق کتنا واضح اور قوی ہوگا

دوسری وجہ: یہ کہ وہ رب جو پوری کائنات کا خالق ہے اور تمام وجوہ سے کامل واکمل ہے اپنی صفات میں اس مخلوق کے مشابہ کیسے ہوسکتا ہے جو اس کی مربوب ہے۔محض ناقص ہے اور اپنی تکمیل میں اس کی محتاج ہے۔مشابہت کا یہ عقیدہ خالق کائنات کے حق میں تنقیص کے مترادف ہوگا؛ کیونکہ کامل کو ناقص سے تشبیہ دینا، اس کامل کو ناقص قرار دینا ہے۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ ہم مختلف مخلوقات کی بعض ایسی صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو نام کی حد تک متفق ہوتی ہیں مگر ان کی حقیقت وکیفیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔مثلاً: انسان کا بھی ہاتھ ہے

اور ہاتھی کا بھی ہاتھ ہے، لیکن انسان کا ہاتھ ہاتھی کے ہاتھ جیسا نہیں ہے۔انسان کی قوت وطاقت اونٹ کی قوت جیسی نہیں ہے۔حالانکہ نام ایک ہی ہے، یہ بھی ہاتھ ہے اور وہ بھی ہاتھ ہے...... یہ بھی قوت ہے اور وہ بھی قوت ہے۔مگر دونوں کی کیفیت اور وصف میں بڑا فرق ہے۔جس سے معلوم ہوا کہ نام کے ایک ہونے سے حقیقت ایک نہیں ہوجاتی۔

واضح ہو کہ تمثیل کا جو معنی ہم نے بیان کیا، اسی معنی میں لفظِ تشبیہ بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض علماء نے دونوں لفظوں میں فرق بیان کیا ہے۔ان کے نزدیک تمثیل سے مراد تمام صفات میں برابری پیدا کرنا، جبکہ تشبیہ سے مراد اکثر صفات میں برابری پیدا کرنا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں نفیٔ تمثیل کی تعبیر زیادہ بہتر ہے تاکہ قرآن حکیم کی موافقت حاصل ہوجائے یعنی فی قولہ تعالیٰ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

تکییف: سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت بیان کرنا، یعنی بندے کا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت اس طرح اور اس طرح ہے۔اس کیفیت کو کسی مماثل کے ساتھ مقید نہ کرے (کیونکہ مماثل کے ساتھ مقید کرنا تمثیل کہلاتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی صفات کے سلسلہ میں کیفیت بیان کرنے کا عقیدہ بھی بدلیلِ نقل وعقل باطل ہے۔

نقلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ:۱۱۰)

ترجمہ: (مخلوق کا علم اس پر حاوی نہیں ہوسکتا)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (الاسراء:۳۶)

ترجمہ: (جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ۔کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے)

یہ بات معلوم ہے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت کا کوئی علم نہیں ہے، کیونکہ

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی صفات کی خبر تو دی ہے، لیکن صفات کی کیفیت نہیں بتلائی، لہذا ہمارا اپنی طرف سے کیفیت بیان کرنا ایک ایسی بے مقصد گفتگو قرار پائے گا جس کا نہ تو ہمیں علم ہے اور نہ ہی ہمارے لیئے اس کا احاطہ ممکن ہے۔

عقلی دلیل: یہ ہے کہ ایک شیٔ کی صفات کی کیفیت کی معرفت تب ہی ممکن ہوسکتی ہے جب اس کی ذات کی کیفیت کا علم ہو یا اس ذات کی کیفیت کا علم تو نہ ہو لیکن اس کی کسی ہم مثل ومساوی شیٔ کا علم ہو، اور یا پھر کسی خبرِ صادق کے ذریعہ وہ کیفیت بتادی جائے، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت کے بارہ میں یہ سارے طرق منتفی ہیں، لہذا ان صفات کی کیفیت بیان کرنے کا عقیدہ قطعاً وحتماً باطل ہوگیا۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی صفات کی کس کیفیت کو ذہن میں بٹھاؤ گے؟؟؟ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی جو بھی کیفیت تمہارے ذہن میں ہو، اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور عظمت وجلالت والا ہے۔ تو پھر لامحالہ جو کیفیت اپنے ذہن میں لاؤ گے تم اس میں جھوٹے ہوگے، کیونکہ تمہارے پاس کیفیت کا کوئی علم نہیں ہے، لہذا ضروری ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تکییف سے یکسر باز آجائے، نہ اس کی کیفیت کا دل میں تصور لائے، نہ زبان سے بیان کرے، نہ قلم سے تحریر کرے۔

یہی وجہ ہے کہ جب امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش کی کیفیت کیا ہے؟ تو (اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے) آپ نے اپنا سر جھکالیا اور پسینے میں شرابور ہوگئے، پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا استواء علی العرش معلوم ہے، لیکن کیفیت معلوم نہیں، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور کیفیت کا سوال کرنا بدعت ہے۔[1] امام مالک رحمہ اللہ کے شیخ ربیعہ سے بھی اسی

---

[1] اس اثر کو امام بیہقی نے الاسماء والصفات (۱۵۱/۲) اور امام لالکائی نے شرح اصول اعتقاد اھل السنۃ (۳۹۸/۲) اور امام ذہبی نے ''العلو'' میں ذکر فرمایا ہے، شیخ السلام نے صحیح اور ثابت کہا ہے، شیخ البانی نے مختصر العلو میں صحیح کہا ہے۔

طرح کا قول منقول ہے یعنی: استواء علی العرش معلوم ہے اور کیفیت غیر معلوم ہے۔

تو جب صفات کی کیفیت شریعت نے بیان نہیں کی ، اور ہماری عقل میں بھی یہ کیفیت نہیں آسکتی تو پھر تکییفِ صفات سے گریز ضروری ہوگیا...... لہذا کیفیت بیان کرنے ، یا اس قسم کی کوئی بھی کوشش کرنے سے بچو۔ اور اچھی طرح بچو۔ اور جان لو کہ اگر تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو ایک ایسے خطرناک صحراء میں داخل ہوجاؤ گے جس سے خلاصی اور چھٹکارے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ اور اگر کبھی کیفیتِ صفات کا کوئی خیال دل میں پیدا ہو تو سمجھ جاؤ کہ شیطان اپنا وار کرنے کی کوشش کررہا ہے، فوراً اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ولاچار ہوجاؤ کہ وہ تمہارا مرکزِ پناہ ہے، اور اس کے بعد وہی کچھ کرتے جاؤ جو اللہ تعالیٰ حکم دے کہ وہ بہترین طبیب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ (فصلت:٣٦)

ترجمہ: (اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آئے تو اللہ سے پناہ طلب کرو۔ یقیناً وہ بہت ہی سننے والا ہے)

ساتواں قاعدہ

﴿ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات توقیفی ہیں، جن کے اثبات میں عقل کو کوئی دخل حاصل نہیں ﴾

لہذا ہم اللہ تعالیٰ کیلئے صرف ان صفات کو ثابت کریں گے جن کے اثبات پر کتاب وسنت کی دلیل موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ کی صرف وہی صفت بیان کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیئے بیان فرمادی، یا رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث سے تجاوز جائز نہیں ہوگا۔ (اسماء کے سلسلہ میں قاعدہ نمبر (۵) دیکھیئے)

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کے اثبات کیلئے قرآن وحدیث میں تین صورتیں ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی صفت صراحت کے ساتھ بیان ہو۔مثلاً :صفتِ " العزۃ، الرحمۃ، البطش، الوجہ ،اور الیدین "وغیرہ

(۲) دوسرا طریقہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مذکور ہوں، ان اسماء کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔مثلاً: "الغفور " اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور اس کے ضمن میں صفتِ مغفرت ہے۔"السمیع " اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور اسکے ضمن میں صفتِ سمع ہے۔(اس سلسلہ میں اسماء کا قاعدہ نمبر(۳) دیکھیئے۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل یا وصف مذکور ہو جو اللہ تعالیٰ کی صفت پر دلالت کرتا ہو۔مثلاً: اللہ تعالیٰ کا استویٰ علی العرش یا اللہ تعالیٰ کا آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرمانا یا اللہ تعالیٰ کا مجرمین سے انتقام لینا۔

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تمام افعال وصفات بالترتیب درج ذیل نصوص سے ثابت ہو رہے ہیں (اور یہ تمام افعال وصفات اللہ تعالیٰ کی صفات کو متضمن ہیں۔)

﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ (طٰہٰ:۵)

ترجمہ: (جو رحمٰن ہے، عرش پر قائم ہے)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ینزل ربنا الی السماء الدنیا]

ترجمہ: [ہمارا رب آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر:۲۲)

ترجمہ: (تیرا رب (خود) آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر (آجائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّا مِنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴾ (السجدۃ:۲۲)

ترجمہ: (یقین مانو) کہ ہم بھی گنہگاروں سے انتقام لینے والے ہیں)۔

﴿قواعد فی ادلة الأسماء والصفات﴾

پہلا قاعدہ

﴿وہ ادلہ جن سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات ثابت ہوتے ہیں، صرف دو ہیں۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ رسول اللہ ﷺ

ان کے بغیر (کسی اور دلیل سے) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات ثابت نہیں ہو سکتے۔﴾

چنانچہ کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کیلئے جن اسماء وصفات کا اثبات وارد ہے، ان کا اثبات واجب ہے۔ اور کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی نفی وارد ہے، اس کی نفی واجب ہے، اس طرح کہ اس نفی کی ضد (صفتِ کمال) کو اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کیا جائے اور قرآن وسنت میں جس صفت کا نہ تو اثبات وارد ہو اور نہ نفی، اس صفت کے لفظ کے بارہ میں توقف کیا جائے...... چنانچہ نہ تو اسے اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کیا جائے، اور نہ ہی اس کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی جائے، کیونکہ قرآن وسنت میں نہ تو اس کا اثبات وارد ہے نہ نفی۔ لیکن اس کے معنی کے حوالے سے تفصیل اختیار کی جائے گی، چنانچہ اس لفظ کا معنی اگر حق ہے جو اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان ہے تو وہ معنی قابلِ قبول ہوگا، اور اگر اس لفظ سے ایسا معنی مراد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان نہیں تو اس کا رد کرنا واجب ہے۔

(۱) اثبات کی مثالیں:

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی وہ تمام صفات جن پر اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ دلالت کرتے ہیں، خواہ دلالتِ مطابقت ہو یا تضمن یا التزام...... اسی طرح وہ تمام صفات جو اللہ تعالیٰ کے مختلف افعال سے ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً: استواء علی العرش، آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرمانا، اور قیامت کے دن بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کیلئے آنا، وغیرہ۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی انواع کا احاطہ ممکن نہیں ہے، ان افعال کے افراد کے

احاطے کی تو بات ہی کیا؟ ﴿وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ﴾ (ابرھیم:۲۷) ترجمہ: (اللہ جو چاہے کر گزرے)

اللہ تعالیٰ کی صفات میں "الوجہ (چہرہ)" "العینان" (دو آنکھیں) "الیدین" (دو ہاتھ) بھی مذکور ہیں، اسی طرح کلام فرمانا، مشیت فرمانا، اور ارادہ فرمانا (بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں) ارادہ خواہ شرعیہ ہو یا کونیہ، ارادہ کونیہ بمعنی مشیت ہے اور ارادہ شرعیہ بمعنی محبت ہے۔

اسی طرح رضا، محبت، غضب اور کراہت وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں (چونکہ یہ تمام صفات کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں، لہٰذا انہیں بلا کسی تاویل اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کرنا واجب ہے)

(۲) نفی کی مثالیں

کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ سے جن صفات کی نفی ثابت ہے ان میں موت، نیند، اونگھ، عجز، تھکاوٹ، ظلم، بندوں کے اعمال سے غفلت، کسی کا اس کے مثل ہونا یا کسی کا اس کے برابر ہونا وغیرہ ہیں (ان تمام صفات کی اللہ تعالیٰ سے نفی وارد ہے، لہٰذا ہم بھی ان کے اللہ تعالیٰ سے منتفی ہونے اور ان کے مقابل صفتِ کمال کے ثابت ہونے پر ایمان لائیں)

(۳) وہ صفات جن کا کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کیلئے نہ تو اثبات وارد ہے نہ نفی، ان میں لفظِ "جہت" کی مثال دی جاسکتی ہے، چنانچہ اگر کوئی سوال کرے کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کیلئے جہت ثابت کریں؟ ہم جواب دیں گے کہ لفظِ جہت کا کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کیلئے نہ تو اثبات وارد ہے نہ نفی...... لہٰذا اس لفظ کی بجائے وہ صفت ثابت کریں جو کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا آسمانوں میں (عرش کے اوپر) ہونا۔ اب جہاں تک جہت کے معنی کا تعلق ہے تو اس لفظ کے تین معنی ہوسکتے ہیں۔

(۱) جہتِ سفل، یعنی نیچے کی جہت

(۲) جہتِ علو۔یعنی اوپر کی جہت،لیکن اس طرح کہ اس جہت نے اللہ تعالیٰ کو گھیر رکھا ہو۔

(۳) جہتِ علو۔یعنی اوپر کی جہت اس طرح کہ اس جہت نے اللہ تعالیٰ کو نہ گھیرا ہو۔

جہت کا پہلا معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں باطل ہے؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علو کے منافی ہے،اور اللہ تعالیٰ کا علو کتاب وسنت سے ثابت ہے۔اس کے علاوہ عقل،فطرت اور اجماعِ امت بھی اللہ تعالیٰ کے علو کو ثابت کرتے ہیں۔

جہت کا دوسرا معنی بھی اللہ تعالیٰ کے حق میں باطل ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اتنا بڑا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔

تیسرا معنی حق ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ ''العلی'' بلند ہے اپنی ساری مخلوقات کے اوپر ہے اور اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔

اس قاعدہ پر(کہ اللہ تعالیٰ کی صفات، کتاب وسنت ہی سے ثابت ہوتی ہے)نقل وعقل کی دلیل موجود ہے۔

نقلی دلیل:اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(الانعام:۱۵۵)

ترجمہ:(اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر وبرکت والی،سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو،تاکہ تم پر رحمت ہو)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿ فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾(الاعراف:۱۵۸)

ترجمہ:(اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اسکے نبی اُمی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اسکے احکام پر ایمان رکھتا ہے،اور ان کی اتباع کرو تاکہ تم راہ پر آجاؤ)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:﴿وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

ترجمہ: (تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ) (الحشر:۷)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنۡ تَوَلّٰى فَمَاۤ أَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا﴾ (النساء:۸۰)

ترجمہ: (اس رسول (ﷺ) کی جو اطاعت کرے اسی نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی، اور جو منہ پھیر لے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا﴾ (النساء:۵۹)

ترجمہ: (پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَأَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ أَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ أَهۡوَاۤءَهُمۡ﴾

ترجمہ: (آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم کیا کیجئے، ان کی خواہشوں کی تابعداری نہ کیجئے) (المائدۃ:۴۹)

اس کے علاوہ بہت سے نصوص موجود ہیں جنکی دلالت یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جو کچھ آ گیا ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

واضح ہو کہ قرآن مجید کی ہر وہ نص جو قرآنِ حکیم کے کسی حکم پر ایمان کو واجب قرار دیتی ہے وہ سنتِ رسول کے ہر حکم پر ایمان لانے کے وجوب پر بھی دال ہوتی ہے؛ کیونکہ قرآنِ حکیم نے ہی نبی ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور قرآن حکیم ہی نے اختلافات وتنازعات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا دینے کا حکم دیا ہے، اس لوٹانے کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آپکی ذات کی طرف رجوع کیا جائے، اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپکی سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔

اتباعِ رسول سے کفر وانکار کرنے والے شخص کا قرآن پر ایمان کہاں رہا؟ کیونکہ قرآن ہی اتباعِ رسول کا حکم دیتا ہے !اسی طرح اختلافات وتنازعات کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع نہ کرنے والے شخص کا قرآن پر ایمان کہاں رہا؟ کیونکہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے اختلافات کو صرف رسول اللہ ﷺ پر پیش کرو۔

اسی طرح جو شخص رسول اللہ ﷺ کی سنت کو قبول نہیں کرتا اس کا رسول اللہ پر کیا ایمان رہا؟ اور ایمان بالرسول کا بھی قرآن پاک ہی نے حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل:۸۹)

ترجمہ: (ہم نے آپ (ﷺ) پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے)

اور یہ بات معلوم ہے کہ شریعت کے بہت سے اعتقادی وعملی امور کا بیان صرف سنتِ رسول اللہ میں موجود ہے، لہذا سنت کا وہ بیان قرآن مجید کا بیان قرار پائے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ہی کو ﴿تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ فرمایا ہے)

عقلی دلیل: واضح ہو کہ مذکورہ قاعدہ یعنی اسماء وصفات کے اثبات کیلئے دلیل یا تو کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ ہے، اور یہ کہ اس اثبات میں عقل کو کوئی دخل نہیں، اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے کسی صفت کا اثبات واجب ہے اور کسی کا ممتنع۔ یہ امورِ غیبیہ میں سے ہے جس کا عقل کے ذریعہ ادارک ممکن نہیں ہے، لہذا اس سلسلہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع اور ارتکاز وافتقار واجب ٹھہرا۔

دوسرا قاعدہ

﴿ قرآن وسنت کے نصوص کے سلسلہ میں ایک ضروری اور اہم قاعدہ یہ ہے کہ انہیں ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے اور کسی قسم کی تحریف کا ارتکاب نہ کیا جائے ﴾

بالخصوص اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل نصوص کیلئے (تو یہ قاعدہ اچھی طرح قلوب واذہان میں

راسخ کرلیا جائے) کیونکہ صفات میں عقل ورائے کی کوئی جگہ نہیں۔

اس قاعدہ پر نقلی وعقلی دلائل موجود ہیں۔

نقلی دلائل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿نَـزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ .عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ .بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء:۱۹۳تا۱۹۵)

ترجمہ: (اسے امانت دار فرشتہ لیکر آیا۔آپ کے دل پر اتارا ہے کہ آپ آگاہ کرنے والوں میں سے ہوجائیں۔صاف عربی زبان میں)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿إِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یوسف:۲)

ترجمہ: (یقیناً ہم نے اسکو عربی قرآن بنا کر نازل فرمایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (الزخرف:۳)

ترجمہ: (یقیناً ہم نے اسکو عربی قرآن بنا کر نازل فرمایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو)

ان آیات کی واضح دلالت یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن عربی زبان میں اترا،لہذا عربی لغت کے ظاہری مقتضی پر اس کا فہم ضروری ہے،الا یہ کہ کوئی دلیلِ شرعی ظاہر پر محمول کرنے سے مانع ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہودیوں کی اس لیئے شدید مذمت کی کہ انہوں نے نصوصِ وحی میں تحریف کا ارتکاب کیا۔اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ وہ اس تحریف کی وجہ سے پوری کائنات میں سب سے زیادہ ایمان سے بہکے ہوئے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهُ مِنْ بَعْدِ مَاعَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۷۵)

ترجمہ: (مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایماندار بن جائیں،حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر،عقل والے ہوتے ہوئے،پھر بھی بدل ڈالتے ہیں)

نیز فرمایا: ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ (النساء:۴۶)

ترجمہ: (بعض یہود، کلمات کو ان کی ٹھیک جگہ سے ہیر پھیر کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی)

عقلی دلیل: یہ ہے کہ ان نصوص کا متکلم (یعنی اللہ) اپنی مراد کو دوسروں سے بہتر اور زیادہ جاننے والا ہے اور اس ذات نے بڑی فصیح عربی زبان میں بندوں کو مخاطب کیا ہے۔ لہذا ان نصوص کو ظاہری معنی پر قبول کرنا واجب ہوگا، بصورتِ دیگر مختلف آراء سامنے آئیں گی اور یہ امت مسلسل تقسیم وتفریق کا شکار ہوتی رہے گی۔ واللہ المستعان

تیسرا قاعدہ

﴿نصوصِ صفات کے ظاہر کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت ہمیں معلوم ہے، جبکہ دوسری حیثیت مجہول ہے۔﴾

چنانچہ ایک حیثیت معنی کی ہے اور دوسری کیفیت کی۔ معنی معلوم ہے اور کیفیت مجہول ہے...... نصوصِ صفات کے معنی معلوم ہونے پر نقلی وعقلی دلیل موجود ہے۔

نقلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ (ص:۲۹)

ترجمہ: (اور یہ بابرکت کتاب جسے ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں اور عقلمند اس سے نصیحت حاصل کریں)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ (الزخرف:۳)

ترجمہ: (یقیناً ہم نے اسکو عربی قرآن بنا کر نازل فرمایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾ (النحل:۴۴)

ترجمہ: (یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں شاید کہ وہ غور کریں)

ان آیاتِ کریمہ سے ثابت ہوا کہ قرآنی نصوص کے معانی معلوم ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قرآنِ حکیم میں تدبر، تعقل اور تفکر کا حکم دیا ہے، تا کہ اس تدبر کے ذریعہ فہم معنی تک رسائی ہوجائے اور فہم معنی کے بعد نصیحت قبول کرنے کی راہ ہموار ہوجائے ......تو اگر نصوص کا معنی معلوم ہونا ممکن نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا قرآن حکیم میں تدبر و تفکر کا حکم بے مقصد ہوتا......

(والعیاذ باللہ)

قرآن حکیم کا عربی زبان میں اترنا تا کہ عربی کا فہم رکھنے والے اس کتابِ مقدس کو سمجھ سکیں، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نصوصِ قرآنی کے معانی معلوم ومفہوم ہو سکتے ہیں، ورنہ قرآن مجید کے عربی اور غیر عربی میں نازل ہونے میں کوئی فرق نہ ہوتا......

پھر نبی ﷺ کا لوگوں کیلئے قرآن پاک بیان کرنا اس کے لفظ اور معنی دونوں کے بیان کو شامل ہے (تو آپ ﷺ کا معنی بیان کرنا نصوصِ قرآنی کا معنی سمجھنے کیلئے ہے اور سمجھنا ممکن ہے اور سمجھنا چاہیئے)

عقلی دلیل: اس پر عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کتاب نازل فرمائے، یا رسول اللہ ﷺ گفتگو فرمائیں، اور اس کتاب اور گفتگو سے مقصود لوگوں کی ہدایت ہو لیکن اس کتاب یا گفتگو کا سب سے اہم مسئلہ (صفاتِ باری تعالیٰ) کا معنی نا قابلِ فہم ہو اور بمنزلہ حروفِ تہجی ہو کہ کسی حرفِ تہجی سے معنوی اعتبار سے کچھ نہیں سمجھا جا سکتا؟؟...

یہ تو ایک ایسی سفاہت ہوگی جس کا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ قطعی انکار کرتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا اپنی کتاب کی بابت ارشاد ہے:

﴿كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ﴾ (ھود:۱)

ترجمہ: (یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے)

یہاں ہم نے عقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ نصوصِ صفات کے معانی معلوم ہیں......

دوسری بات ہم نے یہ کہی تھی کہ ان صفات کی کیفیت مجہول ہے۔ کیفیت کے مجہول ہونے کے حوالے سے، ہم نے قواعدِ صفات کے قاعدہ نمبر (٦) میں نقلی و عقلی اُدلہ تحریر کر دیئے ہیں۔ لہذا قاعدہ نمبر (٦) دیکھ لیا جائے۔

واضح ہو کہ ہم نے نصوصِ صفات کے معانی کے علم ہونے کو دلائل نقل وعقل سے ثابت کیا ہے، جس سے مفوضہ کے مسلک کا باطل ہونا ثابت ہو گیا...... مفوضہ، صفاتِ باری تعالیٰ کے نصوص کے معانی کے علم کے بارہ میں تفویض کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نصوصِ صفات کے معانی بھی ہم نہیں جانتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ مفوضہ کا دعویٰ ہے کہ سلف صالحین کا مذہب بھی یہ ہے، مفوضہ کا یہ قول صراحۃً باطل ہے اور سلف صالحین معانی کی تفویض کے عقیدہ سے بری ہیں۔ ان سے تواتر کے ساتھ ایسے اقوال منقول ہیں جو صفات کے معانی کے اثبات پر دال ہیں۔ کبھی وہ معانی اجمالاً ہوتے ہیں تو کبھی تفصیلاً۔ البتہ وہ صفات کی کیفیت کے بارہ میں تفویض کا عقیدہ رکھتے ہیں...... یعنی کیفیت کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے ہم صفات کا صرف معنیٰ جانتے ہیں، کیفیت نہیں جانتے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب ''العقل و النقل'' (١١٦/١) جو منہاج السنۃ کے حاشیہ پر مطبوع ہے، میں فرماتے ہیں:

''جہاں تک (نصوصِ صفات کے معانی کی) تفویض کا تعلق ہے تو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں تدبر کا حکم دیا ہے، اور اس کے تعقل وفہم کی ترغیب دلائی ہے۔ مزید فرماتے ہیں: (اگر یہ بات مان لیں کہ نصوصِ صفات کے معانی صرف اللہ ہی جانتا ہے) تو پھر یہ

کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں جو اپنی صفات بیان کی ہیں انبیاء ان کے معانی سے ناواقف تھے، تو گویا انبیاءِ کرام لوگوں کے سامنے ایک ایسا کلام پڑھتے رہے جس کا معنی وہ خود بھی نہیں جانتے (والعیاذ باللہ)...... یہ بات تو قرآن پاک اور انبیاءِ کرام دونوں کے حق میں موجبِ جرح وطعن ہوگی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن اتارا ہے اور اسے لوگوں کیلئے بیان اور ہدایت قرار دیا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کو اسے مکمل طور پر پہنچا دینے پر مامور کیا ہے، نیز انہیں اس بات کا بھی پابند کیا ہے کہ وہ لوگوں کو اس کا بیان بھی سکھلا دیں پھر تمام لوگوں کو قرآنِ پاک پر تدبر وتعقل کا حکم دیا ہے تو اس سب کے بعد قرآنِ پاک کے سب سے اشرف واعلیٰ حصے یعنی ربِ کائنات کی صفات کے معانی کا علم نہ ہونا انتہائی تعجب خیز ہوگا۔

اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان نصوص پر تعقل وتدبر نہ کیا جائے، اور رسول اللہ ﷺ نے نہ تو بلاغِ مبین کے تقاضے پورے کیئے اور نہ ہی اس وحیِ مُنزَّل کے بیان کا پورا حق ادا کیا۔ (والعیاذ باللہ)

اور اگر یہ حقیقت مان لیں کہ رب تعالیٰ کی صفات کے معانی کا ہمیں علم نہیں تو پھر بدعتی اور ملحد قسم کے لوگوں کیلئے الحاد کا ایک اور دروازہ کھل سکتا ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان نصوص کے تعلق سے ہم نے اپنی عقل ورائے سے جو کچھ سمجھ لیا وہی حق ہے اور نصوص میں اس کا مناقض ومعارض بھی کوئی نہیں، کیونکہ ان نصوص کو مشکل ومتشابہ قرار دیا گیا ہے، جن کا معنی معلوم نہیں اور جس چیز کا معنی معلوم نہ ہو اس سے استدلال جائز نہیں، پس یہ کلام انبیاء سے ہدایت وبیان کے دروازے کے بند ہونے کا موجب ہوگا، جبکہ معارضہ کرنے والوں کیلئے دروازے کھل جائیں گے، اور وہ کہیں گے کہ ہدایت وبیان ہمارے راستہ میں ہے نہ کہ انبیاء کے راستہ میں؛ کیونکہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے جانتے بھی ہیں اور عقلی دلائل سے واضح بھی کر رہے ہیں جبکہ انبیاء تو ان کے معانی سے ہی آگاہ نہیں، بیان تو دور کی بات ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ صفات کے معانی کے تفویض کا قول جسے وہ بزعمِ خویش سنت اور سلفِ

صالحین کی اتباع قرار دے رہے ہیں، مبتدعین وملحدین کا سب سے بدترین قول ہے......'' (شیخ الاسلام کا کلام ختم ہوا) اور یہ انتہائی نفیس اور درست قول ہے، ایک صاحبِ رائے شخصیت کا عمدہ کلام ہے جس پر مزید اضافے کی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ پر وسیع رحمت فرمادے اور ہمیں ان کے ساتھ جنات النعیم میں جمع فرمادے۔

چوتھا قاعدہ:

ظاہری نصوص سے مراد کسی بھی لفظ کا وہ معنی ہے جو اس لفظ کے سامنے آتے ہی فوراً ذہن میں آجائے۔ اسے ''معنیٔ متبادر الی الذھن'' کہا جاتا ہے، بعض اوقات کسی لفظ کے معنیٰ کا تعین سیاقِ کلام یا اضافت کی مناسبت سے ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک لفظ کا ایک عبارت میں کچھ اور دوسری عبارت میں کچھ معنی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

پہلی مثال: لفظِ ''القریۃ'' سے کبھی تو بستی مراد ہوتی ہے، اور کبھی بستی میں رہنے والے لوگ۔

چنانچہ قولہ تعالیٰ ﴿وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ (الاسراء:۵۸)

ترجمہ: (جتنی بھی بستیاں ہیں ہم قیامت کے دن سے پہلے پہلے یا تو انہیں ہلاک کردینے والے ہیں یا سخت تر سزا دینے والے ہیں)

میں القریۃ سے مراد لوگ ہیں۔

اور قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّا مُهْلِكُوْا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ﴾ (العنکبوت:۳۱)

ترجمہ: (اس بستی والوں کو ہم ہلاک کردینے والے ہیں)

میں القریۃ سے مراد بستی ہے جو لوگوں کا مسکن ہوتی ہے۔

دوسری مثال: اگر آپ یوں کہیں: ''صنعت ھذا بیدی'' (یہ چیز میں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے) تو اس مثال میں جو ید (یعنی ہاتھ) مذکور ہے، وہ اس ید یعنی ہاتھ جیسا نہیں ہوسکتا

جواللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکور ہے: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص:۷۵)

ترجمہ: (جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا)

کیونکہ مثال میں جس ہاتھ کا ذکر ہے وہ مخلوق کی طرف منسوب ہے، لہذا یہ مخلوق کے لائق ہاتھ مراد ہوگا، جبکہ آیتِ کریمہ میں خالقِ کائنات کے ہاتھ کا ذکر ہے، جو خالقِ کائنات کے لائقِ شان ہوگا۔۔۔۔۔کوئی بھی سلیم الفطرت یا صحیح العقل انسان خالق کے ہاتھ کو مخلوق کے ہاتھ جیسا یا مخلوق کے ہاتھ کو خالق کے ہاتھ جیسا قرار نہیں دے سکتا۔

تیسری مثال: ''ماعندک الازید'' اور ''ما زید الاعندک'' یہ دو جملے ہیں۔ دونوں جملوں کے کلمات ایک سے ہیں۔ لیکن ترکیب مختلف ہے اور ترکیب کے مختلف ہونے سے معنی بھی تبدیل ہوگیا۔ پہلے جملے کا معنی ہوگا: تمہارے پاس صرف زید ہے۔ دوسرے جملے کا معنی ہوگا: صرف تمہارے پاس زید ہے۔ دونوں جملوں کا معنوی فرق واضح ہے جو صرف اسلوبِ ترکیب کے تغیر سے پیدا ہوا، ورنہ کلمات تو دونوں جملوں کے ایک ہی ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو پھر صفاتِ باری تعالیٰ کے نصوص کے حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ ان کے ظاہر سے مراد معنیٔ متبادر الی الذہن ہوگا۔ اس معنیٔ متبادر الی الذہن کے حوالے سے لوگ تین اقسام میں بٹے ہیں۔

القسم الاول: پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ظاہرِ نصوص سے جو معنیٔ متبادر الی الذہن بنتا ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ کے لائقِ شان ہے اس کو حق قرار دیا اور اس کی اس دلالت کو ثابت و برقرار رکھا۔

یہ طبقہ سلفِ صالحین کا ہے جو اس خالص عقیدے پر مجتمع ہیں جس پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام قائم تھے، یہ وہ لوگ ہیں جو اہل السنۃ والجماعۃ کے لقب کے حقیقی مصداق ہیں، ان کے علاوہ اس عظیم الشان لقب کا کوئی دوسرا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اس پاکیزہ عقیدے پر سلفِ صالحین کا

اجماع ثابت ہے، چنانچہ حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں:

" قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کی جتنی صفات وارد ہیں ان کے اقرار پر، ان کے ساتھ ایمان لانے پر اور انہیں ان کے مجازی معنیٰ کے بجائے حقیقی معنی پر محمول کرنے پر اہل السنۃ کا اجماع ثابت ہے، وہ نہ تو کسی صفت کی کیفیت بیان کرتے ہیں (اور نہ ہی کسی صفت کو حد میں محدود کرتے ہیں) "

قاضی ابو یعلیٰ اپنی کتاب "ابطال التأویل" میں فرماتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل اخبار کو رد کرنا جائز نہیں، نہ ان صفات کی تاویل روا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ انہیں انکے معنیٰ ظاہر پر محمول کیا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کوئی صفت اس کی کسی مخلوق کی صفت سے کوئی مشابہت ومماثلت نہیں رکھتی، تشبیہ کا عقیدہ ہرگز ہرگز اختیار نہ کیا جائے، امام اہل السنۃ امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ عظام سے یہی عقیدہ منقول ومروی ہے۔ "

حافظ ابن عبد البر اور قاضی ابو یعلیٰ کے یہ اقوال شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتوی الحمویۃ (۸۹،۸۷/۵) میں نقل فرمائے ہیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ کو ان کے معنیٰ ظاہر اور متبادر الی الذہن پر محمول کرنے کے حوالے سے یہ مذہب بالکل حق اور ثواب ہے اور یہی جادۂ مستقیم ہے، اور اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانے کے جو تمام ضروری تقاضے ہیں مذہب سلفِ صالحین ان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، چنانچہ علم وانصاف سے اس مذہبِ حق کا تتبع کرنے والا اس حقیقت سے بخوبی آگاہ وآشنا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں دو قضیئے ہیں جن میں سے ایک ماننا پڑے گا، یا تو مذہب سلفِ صالحین حق ہے، یا دوسروں کا مذہب حق ہے۔ دوسرا قضیہ باطل ہے، کیونکہ اگر دوسروں کے مذہب کو حق

جان لیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ صحابہ وتابعین باطل قول پر قائم تھے، اور انہوں نے ایک بار بھی تصریحاً وظاہراً اس قولِ حق کی بات نہیں کی جس کا اعتقاد واجب تھا۔ اب یہ سب کچھ یا تو اس لیئے ہوگیا کہ وہ حق سے نا آشنا تھے، یا حق جانتے تو تھے لیکن چھپا گئے، اور صحابہ وتابعین کے بارہ میں یہ دونوں مفروضے باطل ہیں اور لازم کا باطل ہونا ملزوم کے باطل ہونے پر دال ہوتا ہے، جس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ اسماء وصفات کے تعلق سے حق وہی ہے جس پر اس امت کے سلف، صحابہ کرام وتابعین عظام قائم تھے۔

القسم الثانی : دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے نصوصِ صفات کا معنی ظاہر ومتبادر تو لیا لیکن ایک باطل رنگ کے ساتھ اور وہ تشبیہ ہے، چنانچہ انہوں نے نصوصِ صفات کی دلالت کو تشبیہ کے عقیدہ پر قائم کر دیا، یعنی خالق کی صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ ہیں۔ یہ فرقہ مشبہ ہے اور ان کا مذہب کئی وجوہ سے باطل ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ تشبیہ کا عقیدہ نصوص پر ظلم اور ان کے معنی مراد کو معطل کرنے کے مترادف ہے، بھلا نصوصِ صفات تشبیہ پر کیسے قائم ہو سکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ﴾ (الشوری:۱۱) یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقلِ سلیم کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے ذات وصفات میں ہر لحاظ سے مباین اور جدا ہے تو پھر ان نصوص پر یہ حکم کیونکر لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خالق ومخلوق میں مشابہت پر دلالت کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مشابہت کا جو معنی مشبہ نے سمجھا وہ سلفِ صالحین کے فہم کے خلاف ہے (کیونکہ صحابہ وتابعین میں کوئی تشبیہ کا قائل نہیں تھا) لہذا مشبہ کا مذہب باطل ہوا۔

اگر قائلینِ تشبیہ یہ سوال کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن مجید میں ہماری عقل وفہم کے مطابق مخاطب فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفات، مثلاً: نزول (اترنا) یا ید (ہاتھ) کو ہم انسانوں کے

نزول اور ید کو مثال بنا کر ہی سمجھ سکتے ہے، لہذا تشبیہ کا عقیدہ ثابت ہوگیا، اس کا جواب تین وجوہ سے ہے:

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ جس ذات نے ہمیں ہماری عقل وفہم کے مطابق مخاطب فرمایا ہے اسی کا فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوری:۱۱) یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی ذات نے بندوں کو اپنے لیئے مثالیں بیان کرنے سے منع فرمایا:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل:۷۴)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ کیلئے مثالیں مت بناؤ، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)

اسی ذات نے بندوں کو اس کا ہم مثل بنانے سے منع فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲)

ترجمہ: (خبردار باجود جاننے کے اللہ کے شریک (ہم مثل) مقرر نہ کرو)

اور اللہ تعالیٰ کا پورا کلام حق ہے، جس کا بعض، بعض کی تصدیق کرتا ہے اور یہ کلام پاک ہر قسم کے تناقض سے پاک ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ قائلینِ تشبیہ سے کہا جائے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہو اور تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، مخلوق کی ذات کے مشابہ نہیں ہے، وہ یقیناً یہ بات قبول کرینگے، تو ان سے کہا جائے کہ اسی طرح تم اللہ تعالیٰ کی صفات کو مان لو کہ اس کی کوئی صفت مخلوق کی صفات سے مشابہت نہیں رکھتی۔ کیونکہ صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں وہی بات کی جائے گی جو ذات کے بارہ میں کی جاتی ہے۔ اور جو ذات اور صفات میں فرق کرے گا وہ خود تناقض اور اضطراب کا شکار ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ قائلینِ تشبیہ سے کہا جائے گا کہ تم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو کہ مختلف مخلوقات میں بہت سے لفظ نام کی حد تک متفق ومشترک ہیں، لیکن اس نام کے

حوالے سے ہرمخلوق کی حقیقت دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ کہے گا: کیوں نہیں، یہ بات درست ہے۔تو اس سے کہا جائے گا کہ جب تم ان صفات کے تعلق سے مخلوقات کے مابین فرق اور تباین کو سمجھتے اور جانتے ہوتو خالق اور مخلوق کے مابین فرق کو کیوں نہیں سمجھتے ؟ حالانکہ خالق اور مخلوق کے مابین فرق اور تباین زیادہ بڑا اور واضح ہے، بلکہ خالق اور مخلوق کے مابین مشابہت اور مماثلت کا پایاجانا محال ہے۔جیسا کہ قواعدِ صفات کے قاعدہ نمبر۶ میں گزر چکا۔ معنی باطل

القسم الثالث : تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے نصوصِ صفات سے ایک باطل معنی مرادلیا، جو ہرگز اللہ تعالیٰ کے لائق شان نہیں اور وہ معنی ''تشبیہ'' ہے، پھر انہوں نے مشبہ کی طرح تشبیہ کاعقیدہ اپنانے کی بجائے ،تشبیہ سے بچنے کیلیئے صفات کے انکار کا راستہ اپنالیا۔

یہ فرقہ معطلہ ہے، جن میں سے بعض نے اسماء وصفات دونوں کا انکار کردیا اور بعض نے اسماء کو تومان لیا لیکن ان سے حاصل ہونے والی صفات کا انکار کردیا......معطلہ نے نصوصِ صفات کے ظاہری معانی سے صرفِ نظر کر کے،خودساختہ معانی تراش لیئے جو محض ان کی بیمار عقول کی پیداوار ہیں،ان معانی کی تعیین میں وہ آپس میں خود بڑی حیرت واضطراب کا شکار ہیں ......اوراسے وہ تاویل کا نام دیتے ہیں جو درحقیقت تحریف ہے۔

واضح ہو کہ معطلہ کا مذہب کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) ان کی یہ روش نصوصِ صفات پر ظلم وتعدی کے مترادف ہے، کیونکہ انہوں نے ان نصوص کی اپنی عقلوں سے تراشے ہوئے ایک معنی باطل پر بناء قائم کی، وہ معنی باطل نہ تو شانِ باری تعالیٰ کے لائق ہے اور نہ ہی ربِ کائنات کی مراد ہے۔

(۲) تمہارا یہ کردار اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کو اس ظاہری معنی سے پھیر دینے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ نے نہایت فصیح عربی زبان میں لوگوں سے خطاب فرمایا ہے، تا کہ لوگ اس خطاب کو عربی زبان کے ظاہری مقتضیٰ کے مطابق اچھی طرح سمجھ سکیں۔ نبی ﷺ نے ایک

انسان کی جو سب سے فصیح زبان ہوسکتی ہے اسی میں لوگوں کو خطاب فرمایا ہے، تو پھر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے (جو معطلہ نہیں کررہے) ہاں اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حق میں تکییف اور تمثیل سے یکسر بچا جائے۔

(۳) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو ظاہری معنی سے پھیرتے ہوئے، معنیٰ مخالف کو مراد لینا، اللہ تعالیٰ پر قولِ بلا علم ہے، جو کہ حرام ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَّأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف:۳۳)

ترجمہ: (آپ فرمایئے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کہو جس کو تم جانتے نہیں)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (الاسراء:۳۶)

ترجمہ: (جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ)

چنانچہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کو اس کے معنیٰ ظاہر وحقیقی سے پھیر کر، معنیٰ مخالف مراد لینے والا ایسی بات پر قائم ومصر ہے جس کا اسے کوئی علم نہیں، اور کسی علم کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ پر اپنے قول باندھ رہا ہے، اور اس میں دو خرابیاں لازم آرہی ہیں:

(۱) ان نصوصِ صفات کا جو ظاہری وحقیقی معنی ہے اور جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی مراد ہے اس کے بارہ میں اس کا خیال ہے کہ یہ مراد نہیں ہے۔

(۲) ان نصوص کا جو معنیٰ مخالف وہ مراد لے رہا ہے اس کی اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کا ظاہری وحقیقی معنیٰ کوئی تائید نہیں کر رہا۔

یہ قاعدہ معلوم ہے کہ اگر کسی لفظ میں دو معانی کا احتمال ہو اور دونوں احتمال مساوی الدرجہ ہوں تو ان میں سے ایک معنیٰ چھوڑ کر دوسرے کا تعین قولِ بلاعلم ہے۔اور یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ معطلہ جس معنیٰ کا تعین کر رہے ہیں وہ متساوی الاحتمال تو ہرگز نہیں، بلکہ مرجوح ہے، بلکہ ظاہر کلام کے بالکل مخالف ہے۔

مثال: اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا تھا: ﴿مَامَنَعَکَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَاخَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾
ترجمہ: (جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟)(ص:۷۵)

اب یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام کے ظاہر سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں......ان لوگوں نے اس کلام کو ظاہری معنیٰ سے پھیرا اور کہا کہ یہاں حقیقی ہاتھ مراد نہیں ہیں، بلکہ ہاتھ سے یہ مراد ہے، وہ مراد ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ :

اولاً: جس چیز کی تم نے نفی کی اس کی دلیل پیش کرو؟

ثانیاً: نفی کے بعد جس چیز کو ثابت کر رہے ہو اس کی دلیل لاؤ؟

ان دونوں چیزوں کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، لہذا وہ نفیاً واثباتاً اللہ تعالیٰ پر قولِ بلاعلم کے انتہائی خطرناک گناہ کے مرتکب بن گئے۔(والعیاذ باللہ)

(۴) معطلہ کے عقیدے کے ابطال کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ نصوصِ صفات کو ظاہری معنیٰ سے پھیرنا، نبی ﷺ، صحابہ کرام، سلفِ صالحین وائمہ کرام کے عقیدے کے خلاف ہے......اور یہی بات معطلہ کے مذہب کے باطل ہونے کیلئے کافی ہے، کیونکہ حق بلاشبہ وہی ہے جس پر نبی

ﷺ، آپ کے صحابہ کرام، سلفِ صالحین اور ائمہ عظام قائم تھے۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ گروہِ معطلہ میں سے کسی بھی شخص سے پوچھو:

کیاتم اللہ تعالیٰ کی ذات کو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر جانتے ہو؟ کہے گا: نہیں..... پھر پوچھو:

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق جو بھی خبر دے دی کیا اسے حق وصدق مانتے ہو؟ کہے گا: ہاں

پھر پوچھو: کیاتم اللہ تعالیٰ کے کلام سے زیادہ واضح اور فصیح کسی کا کلام جانتے ہو؟ کہے گا: نہیں

پھر پوچھو: کیاتم یہ سمجھتے ہو کہ نصوصِ صفات کے تعلق سے اللہ تعالیٰ اپنی خلق کو اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے تا کہ وہ اپنی عقلوں سے خود ہی حق نکال لیں اور اپنا عقیدہ بنالیں؟ وہ کہے گا: نہیں۔

کسی بھی معطّلی سے یہ گفتگو قرآنی نصوص کے حوالے سے تھی، اب جو رسول اللہ ﷺ کی سنت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات وارد ہیں ان کے حوالے سے کسی بھی اہلِ تعطیل سے پوچھو: کیاتم اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کے رسول ﷺ سے بڑھ کر جانتے ہو؟ کہے گا: نہیں۔ پھر پوچھو: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے بارہ میں جو خبر دی کیاتم اسے صدق وحق مانتے ہو؟ کہے گا: ہاں۔ پھر پوچھو: کیا کوئی بھی شخص نبی ﷺ سے زیادہ واضح اور فصیح بات کرسکتا ہے؟ کہے گا: نہیں۔ پھر پوچھو کیا رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی امت کا خیر خواہ ہوسکتا ہے؟ کہے گا: نہیں۔ تو پھر اسی سے کہو: جب تم یہ سب مانتے ہو تو اپنے اندر اتنی جرأت وشجاعت کیوں نہیں پیدا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے، اور رسول اللہ ﷺ نے اس ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے جو کچھ ثابت فرمادیا اسے اس کے حقیقی وظاہری معنی جو اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان بھی ہے پر محمول کرتے ہوئے تم بھی ثابت کردو اور اس کے مطابق اپنا عقیدہ بنالو، لیکن اس کے برعکس تمہارے اندر یہ جرأت وجسارت کیسے پیدا ہوگئی کہ تم نے اس کے حقیقی معنی کا انکار کرڈالا، اور معنی مخالف مراد لیکر اللہ تعالیٰ پر قولِ بلاعلم جیسے فعلِ شنیع کے مرتکب بن گئے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں اپنی ذاتِ بالا وبرتر کیلئے ثابت فرمادیا، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنتِ مطہرہ میں اس ذاتِ پاک کے لائقِ شان جو کچھ ثابت

فرما دیا، اسے نفیاً واثباتاً ثابت کرنے اور اسکے مطابق عقیدہ بنالینے میں تمہارا کیا نقصان ہے؟ کیا یہ سلامتی کا راستہ نہیں ہے؟ اور جب قیامت کے دن تم سے سوال ہوگا:

﴿مَاذَا اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (القصص:٦٥)

ترجمہ: (تم نے انبیاء ومرسلین کی دعوت کا کیا جواب دیا؟)

تو اس وقت یہ جواب انتہائی مضبوط اور نجات دہندہ ثابت نہ ہوگا؟ کیا تمہارا نصوصِ صفات کو ظاہری معنی سے پھیر کر معنیٔ مخالف لینا تمہاری ذاتی رائے قرار نہ پائے گا؟ اور اگر حقیقی معنی سے پھیرنا جائز بھی مان لیں تو پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ معنیٔ مخالف وہ نہ ہو جو تم نے مراد لیا ہے، بلکہ کچھ اور ہو؟

(٦) اہل تعطیل کے مذہب کے باطل ہونے کی چھٹی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کو مان لینے سے کچھ باطل چیزیں لازم آتی ہیں، اور لازم کا باطل ہونا ملزوم کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جو باطل امور لازم آرہے ہیں ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

(ا) اہلِ تعطیل نے نصوصِ صفات کو ان کے ظاہری معنی سے محض اپنے اس عقیدہ کی بناء پر پھیرا کہ ان نصوص کا ظاہری معنی مراد لینے سے خالق کی مخلوق سے تشبیہ لازم آتی ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ تم نے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کے ظاہری معنی سے تشبیہ کا معنی کہاں سے نکال لیا، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ کا عقیدہ تو کفر ہے، کیونکہ عقیدۂ تشبیہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تکذیب ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:١١) یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

نعیم بن حماد الخزاعی، جو امام بخاری رحمہ اللہ کے مشائخ میں سے ہیں فرماتے ہیں:

"جو اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے اس نے کفر کیا، اور جس نے ان صفات میں سے کسی صفت کا انکار کیا جو اس نے اپنی ذات کیلئے بیان فرمائی ہیں اس نے بھی کفر کیا، اور اللہ

تعالیٰ نے اپنی ذات کی جو صفات بیان کردیں، یا رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کردیں، ان میں تشبیہ نہیں ہے" (''العلو'' للذہبی، شیخ البانی نے اس اثر کو صحیح کہا ہے)

اور یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے کلام کو تشبیہ اور کفر پر محمول کرنا سب سے بڑا باطل ہے۔

(۲) اہلِ تعطیل کے مذہب کو مان لیں تو یہ بات لازم آتی ہے کہ قرآن پاک جو ہر چیز کا تبیان ہے، لوگوں کیلئے ہدایت اور سینوں کیلئے شفاء ہے، نورِ مبین ہے اور حق و باطل کے مابین فرقان کی حیثیت رکھتا ہے نے اسماء وصفات کے باب میں ضروری عقیدہ بیان نہیں کیا، بلکہ اسے بندوں کی عقلوں پر چھوڑ دیا ہے، جس چیز کو چاہے ثابت کریں اور جس چیز کو نہ چاہتے ہوں تو اس کا انکار کردیں۔ اور یہ بات بھی ظاہراً باطل ہے۔

(۳) اہلِ تعطیل کے مذہب کو مان لیں تو یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ نبی ﷺ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور ائمہ سلف صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں جو اعتقاد واجب یا ممتنع یا جائز ہے اس کی معرفت اور بیان سے قاصر تھے (نعوذ باللہ) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں اہلِ تعطیل کا جو عقیدہ ہے (جسے تأویل کا نام دیتے ہیں) اس بارہ میں ان سے ایک حرف بھی وارد یا منقول نہیں ہے۔

اب یہاں دو باتیں لازم آرہی ہیں، یا تو نبی ﷺ، خلفائے راشدین اور ائمہ سلف اس بارہ میں صحیح عقیدہ کے فہم ومعرفت سے قاصر، جاہل اور عاجز تھے۔ یا امت کیلئے ٹھیک طرح بیان نہ کرکے زبردست کوتاہی کے مرتکب تھے...... اور یہ دونوں امر باطل ہیں۔

(۴) معطلہ کے مذہب کو مان لینے سے یہ بات بھی لازم آسکتی ہے کہ اللہ رب العالمین کی معرفت، جو کہ تمام شریعتوں میں سب سے اہم مسئلہ، بلکہ تمام انبیاء ومرسلین کی رسالتوں کا زبدۃ ہے کے تعلق سے لوگوں کیلئے مرجع اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا کلام نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں

اصل مرجع ان کی مضطرب اور متناقض عقول ہیں، جو چیز ان کی عقول کے خلاف ہے اسے ہر ممکنہ کوشش سے تکذیب کا نشانہ بنائیں گے اور اگر تکذیب کی راہ دستیاب نہ ہوسکی تو تحریف کے ذریعے اس کی روح مسخ کر دینگے، (اور اس تحریف کو تأویل کا نام دیکر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرینگے۔)

(۵) (اہلِ تعطیل جس روش پر چل رہے ہیں اسے مان لینے سے) اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی ثابت کردہ صفات کی نفی کا جواز پیدا ہوسکتا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَجَـــاءَ رَبُّکَ﴾ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ مجیئ (یعنی روزِ قیامت آنا) مذکور ہے (اب صفتِ مجیئ اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے ثابت ہوگئی) مگر اہلِ تعطیل اسکی جو تأویل کرتے ہیں اس کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ مجیئ کے انکار کا جواز بن سکتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے فرمان: [یـنـزل ربنا الی سماء الدنیا] [اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے] میں اللہ تعالیٰ کی صفت نـــزول ثابت ہورہی ہے، مگر معطلہ جو تأویل کرتے ہیں اس کی روشنی میں صفت نـزول کے انکار کا جواز بن سکتا ہے۔ کیونکہ معطلہ اللہ تعالیٰ کی صفت مـجیئ اور نـزول کو مانتے تو ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف ان صفات کی مجازی نسبت کے قائل ہیں، اور قائلینِ مجاز کے نزدیک مجاز کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ (بوقتِ ضرورت) اس کی نفی درست ہو، (جس کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو یہ مجازی قرار دے رہے ہیں ان کی نفی ممکن ہے) ہم کہتے ہیں کہ جن صفات کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے بیان فرمادیا ہے ان کی نفی سب سے بڑا باطل ہے......اور ان مقامات پر اس کی ذات کے مـجیئ اور نزول کی جگہ اس کے امر کے مجیئ اور نزول کی تأویل کرنا قطعی ناممکن ہے، کیونکہ سیاقِ کلام میں اس تأویل کی کوئی دلالت یا گنجائش موجود نہیں ہے۔

پھر معطلہ میں سے کچھ تو وہ ہیں جو مذکورہ قاعدہ تمام صفات پر جاری کرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ

کے اسماء کو بھی اسی قاعدہ کی زد میں رکھے ہوئے ہیں۔

جبکہ کچھ معطلہ تناقض کا شکار ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اس گروہ میں اشعریہ اور ماتریدیہ وغیرہ کا نام آتا ہے۔ یہ لوگ اگر کسی صفت کو شامل کرتے ہیں تو محض اس حجت کے ساتھ کہ اس کے صحیح ہونے پر عقل دلالت کررہی ہے، اور اگر کسی صفت کی نفی کرتے ہیں تو محض اس حجت کے ساتھ کہ اس صفت کی عقل نفی کررہی ہے یا یہ کہ اس کی صحت پر عقل دلالت نہیں کررہی۔

ہم ان اشاعرہ سے کہتے ہیں کہ تم جن صفات کی بحجتِ عقل نفی کرتے ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے تو ثابت ہیں ہی، مگر ہم انہیں دلیلِ عقل سے بھی ثابت کرسکتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح تم ان صفات کو دلیلِ عقل سے ثابت کرتے ہو جنہیں تم مانتے ہو۔ مثال کے طور پر: اشاعرہ اللہ تعالیٰ کی صفت ارادہ کو مانتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کی نفی کرتے ہیں۔ صفتِ ارادہ کو اس لیئے مانتے ہیں کہ یہ صفت (بقول ان کے) دلیلِ سمع اور دلیلِ عقل دونوں سے ثابت ہے۔

دلیلِ سمع، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَایُرِیۡدُ﴾ (الحج:۱۴) (بے شک اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو ارادہ فرماتا ہے)
(اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ ثابت ہوگئی)

دلیلِ عقل: یہ ہے کہ مخلوقات کے اندر پایا جانے والا تنوع، نیز ایک مخلوق کی دوسری مخلوق پر باعتبارِ ذات یا صفات پائی جانے والی برتری یا فوقیت (مخلوقات کے ارادے سے نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہے۔ (جس سے عقلاً اللہ تعالیٰ کی صفت ارادہ ثابت ہوئی)

اشاعرہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کی نفی کرتے ہیں، کیونکہ بقول ان کے اللہ تعالیٰ کیلئے صفت رحمت کا اثبات دلیلِ عقل کے خلاف ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ میں صفتِ رحمت مان لیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ رحم کرنے والے کے اندر اس بندے کیلئے جس پر وہ رحم کررہا ہے نرمی اور

رقت کے جذبات پیدا ہوں (یہ انفعالی کیفیت ایک ایسا تغیر ہے) جو اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔

ہم نے جب اشاعرہ کو یاد دلایا کہ صفتِ "رحمت" کا تو قرآن وحدیث میں بہت ذکر موجود ہے؟ تو انہوں نے جواب میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تاؔویل کردی، اور وہ اس طرح کے اللہ تعالیٰ کے رحمت فرمانے سے مراد انعام دینا، یا انعام دینے کا ارادہ یا فیصلہ فرمانا ہے، (یعنی رحیم بمعنی منعم ہے)

ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا صفتِ رحمت سے متصف ہونا قرآن وحدیث کے بے شمار دلائل سے ثابت ہے، بلکہ صفتِ رحمت کے دلائل باعتبار تعداد اور باعتبارِ تنوع، صفتِ ارادہ سے کہیں زیادہ ہیں۔

مثلاً: صفتِ رحمت کہیں تو بصیغۂ اسم وارد ہوئی ہے، جیسے: "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہیں بصورت صفت مذکور ہے، مثلاً: "وَرَبُّکَ الْغَفُوْرُ ذُوْ الرَّحْمَةِ" اور کہیں بصیغہ فعل ذکر ہوئی ہے، مثلاً: "ويرحم من يشاء"

پھر اللہ تعالیٰ کے صفتِ رحمت سے متصف ہونے کا اثبات، دلیل عقل سے بھی ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ بندوں پر ہمہ قسم کی پے درپے نعمتوں کا نزول، اور ہر لحہ ان کی پریشانیوں کا ازالہ (جو سب اللہ کی طرف سے ہے) اس کیلئے صفتِ رحمت کے ثبوت کی انتہائی ٹھوس دلیل ہے۔

اشاعرہ نے صفتِ ارادہ کے اثبات کے لیئے جو عقلی دلیل دی ہے اس کی رو سے صفتِ ارادہ کا مظہر خاص لوگ یا چند افراد ہیں، مگر صفتِ رحمت کا اثر تو ہر خاص وعام پر واقع ہوتا ہے...... اس لحاظ سے صفتِ رحمت کا از روئے عقل، اللہ تعالیٰ کیلئے ثبوت زیادہ واضح اور روشن ہے۔

اشاعرہ نے صفتِ رحمت کے رد کیلئے جو یہ شبہ وارد کیا ہے کہ صفتِ رحمت کا اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات اس بات کو مستلزم ہے کہ اس ذات کے اندر رحم فرماتے وقت نرمی اور رقت کے جذبات پیدا

ہوں (جو ایک ایسا تغیر ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے محال ہے)

ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ اگر یہ حجت درست ہے، تو اس جیسی حجت سے صفتِ ارادہ کا رد بھی ممکن ہے، اور وہ اسطرح کہ صفتِ ارادہ بھی تو اس بات کو مستلزم ہے کہ مرید (یعنی ارادہ کرنے والے) میں مراد (جس کیلئے ارادہ کر رہا ہے) کیلئے جلبِ منفعت یا دفعِ ضرر کا میلان پیدا ہو، یہ بھی تو ایک ایسا تغیر ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔

اگر اشاعرہ اس کے جواب میں کہیں کہ ارادہ کی یہ شکل تو مخلوق کے ارادہ کے ساتھ خاص ہے، لہذا یہ معنی اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ میں پیدا نہ کیا جائے، ہم جواب میں کہیں گے کہ صفتِ رحمت کی تفسیر جو تم نے کی ہے وہ بھی تو مخلوق کے رحم کرنے اور ترس کھانے کے ساتھ خاص ہے لہذا یہ معنی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت میں ہرگز پیدا نہ کیا جائے، کیونکہ مخلوق کا صفتِ رحمت سے متصف ہونا مستلزمِ نقص ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت، صفتِ کمال ہے۔

ہماری اس تقریر سے ثابت ہوا کہ معطلہ کا مذہب حتماً وقطعاً باطل اور مردود ہے، خواہ وہ تمام صفات کی تعطیل کے قائل ہوں یا بعض کی، یہ بھی ثابت ہوا کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے سلسلہ میں جس منہج کو اختیار کیا ہے، اور اس منہج کیلئے جس طریقِ استدلال کو منتخب کیا ہے اس سے معتزلہ اور جہمیہ کے شبہات کا ازالہ ممکن نہیں، (بلکہ اس سے تو ان کے مذہب کو تقویت حاصل ہوتی ہے) اور اس کی دو وجوہ ہیں:

(۱) ایک یہ کہ یہ راستہ بذاتِ خود بدعت ہے، اسماء وصفات کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ، سلفِ صالحین اور ائمہ اُمت اس راہ پر ہرگز نہیں چلے، لہذا معتزلہ اور جہمیہ کا بدعی مذہب، اشاعرہ کے بدعی مذہب سے کیسے رد ہو سکتا ہے، بدعت کی ظلمت تو سنت کے نور سے مردود اور مندفع ہوتی ہے (نہ کہ ایک بدعت کے رد کیلئے دوسری بدعت کی ایجاد سے)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا یہ طریقِ کار جہمیہ اور معتزلہ کو مزید چور دروازہ

فراہم کرنے کا باعث ہے اور وہ اس طرح کے جہمیہ اور معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے منہج کو اپنے لیئے حجت بنا کر ان سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ تم نے جن صفات کی نفی کی ہے اس کی بنیاد تمہاری اپنی اختراع کردہ عقلی دلیل ہے، جبکہ ان صفات پر مشتمل دلیلِ سمع (قرآن وحدیث کے نصوص) کے رد کیلیئے تم نے من مانی تاویل سے کام چلالیا، تو بعینہ اسی منہج کو ہم نے اختیار کیا ہے کہ ہم نے جن صفات کی نفی کی ہے وہ نفی دلیلِ عقل سے کی ہے اور دلیلِ سمع میں تاویل سے کام لیا ہے، تو یہ منہج تمہارے لیئے جائز اور ہمارے لیئے حرام اور ناجائز کیوں ہے؟ جس طرح تمہاری عقول ہیں اسی طرح ہماری بھی عقول ہیں، اگر ہماری عقول غلط ہیں تو تمہاری عقول صحیح کیسے ہوگئیں؟ اور اگر تمہاری عقول درست ہیں تو ہماری عقول کیسے غلط ہوگئیں؟ انکارِ صفات کے ہمارے اس مذہب کی اساس وہی ہے جو تمہارے مذہب کی اساس ہے تو پھر تمہارا، ہمارے مذہب کا انکار کرنا تحکم اور خواہشاتِ نفس کی اتباع کے سوا کچھ نہ ہوا۔

جہمیہ اور معتزلہ کی یہ بات، اشاعرہ وماتریدیہ کیلیئے ایک مسکت اور دندان شکن حجت کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا اشاعرہ کے پاس کوئی جواب نہیں، ہاں صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے اس مذہب سے توبہ کرکے، سلفِ صالحین کے مذہب کی طرف رجوع کرلیں، اور قرآن وحدیث میں جو اللہ تعالیٰ کی اسماء وصفات مذکور ہیں، ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات کیلیئے ایسا اثبات ہو جو ہر قسم کی تمثیل وتکییف سے پاک ہو، نیز جو صفاتِ نقص ہیں ان سے اس ذات پاک کی اس طرح تنزیہ ہو کہ جس میں تعطیل یا تحریف کا کوئی شائبہ نہ ہو (یہ منہجِ سدید درحقیقت وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے سلفِ صالحین کو عطا فرمایا)

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَالَهُ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (النور:۴۰)

ترجمہ: (جسے اللہ تعالیٰ ہی نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہوتی) (وہ ہمیشہ ظلمتوں اور تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے) اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے ممکن ہے۔

واضح ہو کہ جولوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے انکار اور تعطیل کی روش اپنائے ہوئے ہیں وہ صفات کے معطِل اور منکر تو ہیں ہی،لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشبہ اور ممثِل بھی ہیں (یعنی خالق کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ کے بھی قائل ہیں)

اسی طرح جولوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں تشبیہ اور تمثیل کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ مشبہ اور ممثل ہونے کے ساتھ ساتھ منکر اور معطل بھی ہیں، چنانچہ معطلہ کا منکرِ صفات ہونا تو ظاہر وواضح ہے، رہاان کا تشبیہ وتمثیل کے محذور میں گرفتار ہونا تو وہ اس طرح ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات جوسب کی سب کمال ہیں کا اس لیئے انکار کیا کہ اس سے تشبیہ لازم آتی ہے،تو اس صفت کے انکار سے کیا اللہ تعالیٰ کی اس سے بھی ناقص بلکہ معدوم شی سے تشبیہ لازم نہ آئے گی؟ (مثلا اللہ تعالیٰ کے سمیع وبصیر ہونے کا اس لیئے انکار کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو سننے اور دیکھنے والا مان لیں،تو سننے اور دیکھنے کی صفت تو مخلوق کے اندر بھی پائی جاتی ہے،لہذ اتشبیہ لازم آئے گی ،لہذا اس کے سمیع وبصیر ہونے کا انکار ضروری ہے،ہم کہتے ہیں کہ اس طرح تو پھر اندھوں اور بہروں سے مشابہت بن جائے گی ، بلکہ جمادات سے کہ جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں) گویا معطلہ اُولاً: اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں،اور ثانیاً: ناقصات بلکہ معدومات سے تشبیہ کے بھی قائل ہوگئے،اس طرح فرقۂ مشبہ ،اللہ تعالیٰ کی صفات کے مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ کے قائل تو ہیں ہی،لیکن اسکے ساتھ ساتھ معطلین ومنکرینِ صفات کی صف میں بھی کھڑے ہیں،اسکی تین وجوہات ہیں:

(ا) ایک یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی جس صفت کو ثابت کیا،اس کے بارہ میں تشبیہ بالمخلوق کا عقیدہ رکھ کے اس کا انکار بھی کر دیا، کیونکہ وہ نص جواللہ تعالیٰ کی اس صفت کو ثابت کر رہی ہے اس میں تشبیہ بالمخلوق کی کوئی دلالت نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کیلیئے ایک ایسی صفت ثابت کر رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہے(اور یہ ممثل تشبیہ کا عقیدہ رکھ کے گویا اس نص کا منکر ہوگیا،جس سے ثابت ہوا کہ ہر ممثل،منکر اور معطل بھی ہے)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک تشبیہ کا قائل ہر اس نص کا منکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے تشبیہ کی نفی پر مشتمل ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دے کر، اللہ تعالیٰ کے کمالِ واجب کا انکار کر دیا کیونکہ مخلوق تو ناقص ہے (ثابت ہوا کہ تشبیہ کا عقیدہ، تعطیل پر بھی منتج ہوتا ہے)

۴ اہل تأویل کے چند شبہات اوران کا ازالہ

بعض اہل تأویل نے اُهل السنۃ پرایک اعتراض وارد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل، قرآن وحدیث کے بعض نصوص کوتم نے بھی ان کے ظاہری معنی سے پھیرا ہے اور یوں تاویل کا ارتکاب کیا ہے، جس کا معنی یہ ہوا کہ اہل السنۃ خود قرآن وحدیث کے نصوص میں تاویل کے مرتکب ہوئے ہیں یا کم از کم مداھنت کا پہلوضرور اختیار کیا ہے، تو پھر ہمارے تاویل روا رکھنے کا انکار کیوں؟ جبکہ خود بعض مواقع پراس فعل کا سہارالیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم اہل تأویل کے اس اعتراض، جودرحقیقت شبہ ہی قرار پائے گا کے دوجواب دیتے ہیں، ایک مجمل، دوسرا مفصل

مجمل جواب : مجمل جواب مختصراً دونکات میں منحصر ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ جن نصوص کے بارہ میں تم اہل السنۃ کوتأویل کے مرتکب ہونے کا الزام دیتے ہو ہم ان کے بارہ میں قطعاً تسلیم نہیں کرتے کہ اھل السنۃ نے ان کے معنیٔ ظاہر کوپھیرا یا بدلا ہے؛ کیونکہ کسی بھی لفظ یا جملے کا جو معنیٔ مشہور ہوتا ہے وہی ظاہری معنی بنتا ہے، اور یہ معنی، کلام کے ظاہری سیاق وسباق کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے، بعض اوقات ترکیب کلام کی مناسبت سے ایک لفظ کا معنی بدل جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ کلام لفظوں اور جملوں سے ہی ملکر بنتا ہے، لہذا ان لفظوں اور جملوں کے معنی کا تعین تب ہی ممکن ہے جب وہ آپس میں مل کر کلام کی شکل اختیار کریں گے (لہذ ا اگر ایک لفظ کا معنی، کہیں کچھ ہو اور کہیں کچھ ہو تو اس اختلاف کو معنیٔ ظاہر سے انحراف قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ ترکیبِ کلام اور سیاقِ کلام کی مناسبت سے جہاں جو معنی بنے گا وہاں وہی معنی، معنیٔ ظاہر ہوگا)

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر اہل السنۃ کی قرآن وحدیث کی کسی نص کی کسی تفسیر کوظاہری معنی سے عدول تسلیم بھی کرلیا جائے تو ان کا یہ عدول قرآن وحدیث کی دلیل کی بناء پر ہوتا ہے، خواہ وہ

عدول وہیں مذکور ہو یا کسی دوسرے مقام پر۔(گویا اہل السنۃ کا کسی مقام پر معنی ظاہر سے صرفِ نظر ،قرآن وحدیث کی دلیل کی بناء پر ہے،جبکہ اہل تأ ویل کا نصوصِ قرآن وحدیث میں معنیٰ ظاہر سے انحراف ذاتی شبہات کی بناء پر ہے)

ذاتی شبہ تو کوئی دلیل نہیں،مگر اہل تأ ویل اپنے ذاتی شبہات کو براھینِ قطعیہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان کردہ وثابت کردہ صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی کر بیٹھے ہیں (والعیاذ باللہ)

مفصل جواب: مفصل جواب کیلئے ہم ان تمام نصوص کا جائزہ لیتے ہیں جن کے بارہ میں اہل تأ ویل کا دعویٰ ہے کہ سلفِ صالحین نے ان میں ظاہری معنی سے روگردانی کی ہے،اس سلسلہ میں کچھ مثالیں (بمعہ تبصرہ وجواب) پیشِ خدمت ہیں۔

امام غزالی نے بعض حنابلہ سے نقل کیا ہے،وہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل صرف تین احادیث میں تأ ویل کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ایک ''حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے''۔

دوسری،''تمام بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے بیچ میں ہیں''۔

تیسری،''میں رحمٰن کا نفس ،یمن کی طرف سے پاتا ہوں''۔(الاحیاء ۱/۱۷۹)

اس کلام کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ (ص:۳۹۸) میں نقل فرمایا ہے، اور کہا ہے کہ: یہ حکایت امام احمد بن حنبل پر کذب وافتراء ہے۔

ہم ان تینوں مثالوں پر تفصیلی کلام کرتے ہیں

پہلی مثال :[الحجر الأسود يمين الله في الارض]

یعنی حجر اسود زمین پر اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث باطل ہے،اور نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

امام ابن الجوزی " العلل المتناهیه " میں فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن العربی فرماتے ہیں: یہ حدیث باطل اور نا قابلِ التفات ہے۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث نبی ﷺ سے ایک ایسی سند سے مروی ہے جو ثابت نہیں۔[1]

جب یہ حدیث باطل ٹھہری تو پھر اس کے معنی میں غور وخوض کی کوئی ضرورت نہ رہی، تاہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس بارہ میں مشہور بات عبداللہ بن عباس سے مروی ایک اثر ہے، وہ فرماتے ہیں:

" حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے جس نے اس سے مصافحہ کیا یا بوسہ دیا اس نے گویا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا، اور اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دیا "[2]

اس عبارت پر غور کرنے والے ہر شخص پر یہ بات واضح اور عیاں ہوگی کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں ہے، کیونکہ عبداللہ بن عباس نے حجر اسود کو مطلقاً اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ قرار نہیں دیا، بلکہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ کہا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظِ مقید کا حکم لفظ مطلق سے مختلف ہوتا ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ اس سے مصافحہ کرنے والا، یا بوسہ دینے والا گویا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کر رہا ہے یا اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہے...... جملے کی اس ساخت سے بصراحت واضح ہو رہا ہے کہ حجر اسود سے مصافحہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ سے قطعاً مصافحہ نہیں کر رہا، بلکہ حجر اسود سے مصافحہ کرنے والے کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کر رہا ہے، چنانچہ حدیث کے پہلے اور آخری حصہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ حجر اسود اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے، جیسا کہ ہر عقلمند اس بات سے واقف ہے۔ (مجموع الفتاویٰ ج٦ ص٣٩٨)

---

[1] شیخ البانی نے بھی اس حدیث کو الضعیفۃ (١/٢٥٧) میں ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] غريب الحديث لابن قتيبة (٢/٩٦) تاريخ مكة للأزرقي (١/٣٢٤)

دوسری مثال:[قلوب العباد بین الاصبعین من اصابع الرحمن]
یعنی (تمام بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان ہیں)
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح مسلم کتاب القدر کے دوسرے باب میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی روایت سے مذکور ہے، انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[ان قلوب بنی آدم کلها بین اصبعین من اصابع الرحمن کقلب واحد یصرفه حیث یشاء]ثم قال رسول الله ﷺ [اللهم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک]

یعنی (تمام اولادِآدم کے دل، قلبِ واحد کی طرح رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے بیچ میں ہیں، وہ انہیں جس طرح چاہے پھیر دے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی اے اللہ دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے)

سلفِ صالحین اہل السنۃ نے اس حدیث میں کوئی تاویل نہیں کی، بلکہ اس کے ظاہری معنیٰ ہی کو لیا ہے، اللہ تعالیٰ کی حقیقی انگلیاں ہیں ہم انہیں اللہ تعالیٰ کیلئے اسی طرح ثابت کرتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ثابت فرمائیں۔ بندوں کے دلوں کا اللہ تعالیٰ کی دوانگلیوں کے بیچ میں موجود ہونے کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ انگلیاں دلوں کو مس کررہی ہیں، کیونکہ اس سے حلول کا وہم پیدا ہوتا ہے، لہذا یہاں اس جملہ کو معنی ظاہر سے پھیرنا پڑے گا (کیونکہ قرینہ موجود ہے) جیسے بادل زمین وآسمان کے بیچ موجود ہیں، لیکن نہ وہ آسمان کو مس کررہے ہیں نہ زمین کو چھورہے ہیں۔ کہا جاتا ہے ''بدر بین مکة والمدینة ''یعنی چاند مکہ اور مدینہ کے بیچ میں ہے، حالانکہ چاند، مکہ اور مدینہ میں سے کسی سے مس نہیں کررہا ہے، بلکہ مکہ، مدینہ اور چاند کے درمیان کس قدر دوری موجود ہے۔ لہذا بندوں کے دلوں کا اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے بیچ میں ہونا حقیقۃً ثابت

ہے، لیکن اس سے نہ تو مس کرنا لازم آ رہا ہے نہ حلول۔

تیسری مثال: [انی اجد نفس الرحمن من قبل الیمن] (الحدیث)

یعنی (میں رحمٰن کا نفَس یمن کی طرف سے پاتا ہوں)

(یہاں شبہ یہ ہے کہ نفَس کا معنیٰ ظاہر سانس ہے، لیکن یہ معنی مراد نہیں لیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ اہل السنہ نصوصِ صفات میں تاویل کے مرتکب ہوئے ہیں)

جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مسند احمد میں بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ألا ان الایمان یمان والحمکة یمانیة وأجد نفَس ربکم من قبل الیمن] یعنی: (ایمان تو یمنی ہے اور حکمت بھی، اور میں تمہارے پروردگار کے نفَس کو یمن کی طرف سے پاتا ہوں) (مسند احمد (۲/۵۹)

''مجمع الزوائد'' میں ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی (شبیب کے علاوہ) صحیح بخاری کے ہیں، شبیب صحیح بخاری کا راوی نہیں ہے لیکن وہ ثقہ ہے۔ تقریب التھذیب میں شبیب کو ثقہ اور طبقہ ثالثہ کا راوی قرار دیا گیا ہے۔ اس جیسی ایک روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے ''التاریخ الکبیر'' میں بھی روایت فرمائی ہے۔

اس حدیث میں اہل السنہ نے کوئی تاویل نہیں کی، بلکہ معنیٰ ظاہر ہی مراد لیا ہے، چنانچہ ''نَفَسَ'' (بفتح الفاء) بابِ تفعیل ''نفَّس ینفس تنفیسا ونَفَسًا '' سے مصدرِ ثانی ہے اس کے وزن پر دوسری مثال ''فَرَّجَ یفرج تفریجا وفَرَجاً'' دی جاسکتی ہے۔ النھایة، القاموس اور مقاییس اللغہ میں علماءِ لغت نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ مقاییس اللغہ میں ہے ''نَفَسَ سے مراد مکروب یعنی کرب زدہ شخص کے کرب کو دور کرنا ہے۔''

اب حدیث کا معنی یوں ہوگا اللہ تعالیٰ کا مؤمنین کی تکالیف ومصائب کا دور کرنا یمن کی طرف سے ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہلِ یمن ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مرتدین سے جنگیں لڑیں اور بہت سے علاقوں کو فتح کیا، لہذا ان کے ذریعہ رحمٰن نے مؤمنین کی مدد فرمائی اور ان کی تکالیف کا ازالہ فرمایا'' (مجموع الفتاویٰ ۶/۳۹۸)

(تو گویا نَفَس کا مذکورۃ الصدر معنی، معنیٰ ظاہر ہی ہے اور یہاں کسی قسم کی کوئی تاویل نہیں کی گئی)

چوتھی مثال: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ...... الآیۃ﴾ (البقرۃ:۲۹)

جواب: اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اہل السنۃ کے دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ یہاں ''استویٰ الی السماء'' بمعنیٰ ''ارتفع الی السماء'' ہے (مراد آسمان کی طرف چڑھنا اور بلند ہونا) معروف مفسر ابنِ جریر نے اسی معنی کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ اپنی تفسیر میں استواء الی السماء کے معنی کے بارے میں علماء کا اختلاف نقل کرکے فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ'' کا معنی یہ ہے کہ ''پھر وہ آسمانوں پر چڑھا اور بلند ہوا اور اپنی قدرت سے تدبیر فرمائی، اور انہیں سات کی تعداد میں پیدا فرمایا'' امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اس معنی کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے۔

اب یہاں ''استواء الی السماء'' کا معنی ظاہر یعنی ''ارتفاع الی السماء'' مراد لیا گیا، اور ''ارتفاع الی السماء'' کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا گیا، (یعنی بفحوائے آیتِ کریمہ ''ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ'' اس کا آسمان کی طرف چڑھنا ثابت اور برحق ہے، لیکن چڑھنے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں، جسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ضروری ہے)

''استویٰ الی السماء'' کا دوسرا معنی قصدِ تام ہے۔ یعنی ''پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف قصد فرمایا......''

امام ابنِ کثیر نے سورۃ البقرۃ اور امام بغوی نے سورۂ فصلت کی تفسیر میں اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ'' کا معنی یہ ہے کہ

پھراس نے آسمانوں کی طرف قصد فرمایا۔ یہاں ''استواء'' قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ ''الی'' کے ساتھ متعدی ہے۔''

امام بغوی نے بھی ''ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ'' کا معنی ''عمد الی خلق السماء'' کیا ہے، یعنی اس نے آسمانوں کو خلق فرمانے کا قصد فرمایا۔

واضح ہو کہ یہاں ''استواء'' بمعنی ''قصد'' کی تفسیر کلام کو معنی ظاہر سے پھیرنا قرار نہیں دی جاسکتی، کیونکہ فعل ''استویٰ'' حرف ''الی'' سے ملا ہوا ہے اور حرفِ ''الی'' غایت اور انتہاء پر دلالت کرتا ہے، جس کی وجہ سے یہ فعل (استویٰ) ایک ایسے معنی کی طرف منتقل ہو گیا جو حرفِ مقترن یعنی ''الی'' کے بالکل مناسب ہے۔

اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (الدھر:٦)

ترجمہ: (چشمہ، جس سے اللہ کے بندے سیراب ہونگے)

اب ''یشرب'' کا اصل معنی پینا ہے لیکن یہاں سیراب ہونا مراد ہے، (یعنی یشرب بمعنی یروی) کیونکہ فعلِ ''یشرب'' حرفِ باء کے ساتھ ملکر آیا ہے لہذا بمعنی ''یروی'' کی طرف منتقل ہو گیا جو ''باء'' کے مناسب ہے۔

ثابت ہوا کہ بعض اوقات فعل اپنے متعلقہ حرف کی وجہ سے اپنے اصل معنی سے معنیٰ دیگر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، تا کہ کلام میں حرف کے معنی کی مناسبت پیدا ہو جائے۔ (خلاصہ یہ ہے کہ استواء کا مذکورہ معنی، متعلقہ حرف ''الی'' کی مناسبت سے ہے، لہذا یہ معنیٰ ظاہر سے عدول قرار نہیں پائے گا۔

پانچویں اور چھٹی مثال: اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید میں فرمایا

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید:٤)

ترجمہ: (اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

سورۃ المجادلۃ میں فرمایا: ﴿وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾
ترجمہ: (اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے وہ جہاں بھی ہوں)

جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کی اہل السنۃ نے جو تفسیر کی ہے وہ حقیقت اور معنیٰ ظاہر پر قائم ہے۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت (مخلوق کے ساتھ ہونا) کی حقیقت اور ظاہر کیا ہے؟ کیا صفتِ معیت یعنی مخلوق کے ساتھ ہونے کی حقیقت اور ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہے اور ان کی جگہوں اور چیزوں میں حلول کیئے ہوئے ہے؟ یا اس صفتِ معیت کی حقیقت اور ظاہر اس بات کو متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بذاتہ تو تمام مخلوقات کے اوپر، عرشِ معلیٰ پر مستوی ہے، لیکن اپنے علم، قدرت، سمع، بصر، تدبیر، اور بادشاہت وغیرہ کے ساتھ پوری مخلوق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

پہلا قول ظاہر البطلان ہے، آیات کا سیاق اس مفہوم کا ہرگز متقاضی نہیں ہے، نہ ہی کسی صورت اس پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ یہاں صفتِ معیت (ساتھ ہونا) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بڑی ہے کہ کوئی مخلوق اس کا احاطہ کر لے۔ پھر وہ لغتِ عرب جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس میں معیت اختلاط کو مستلزم نہیں ہے، نہ ہی کسی مقام پر بذاتہ موجود ہونا ضروری ہے بلکہ مطلقاً مصاحبت کے معنی پر دال ہے۔ (مصاحبت کی کوئی بھی صورت ہو) اب صفتِ معیت کی ہر مقام پر وہی تفسیر کی جائے گی جو مطابقِ سیاق اور مناسبِ مقام ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کو اختلاط اور حلول کے معنی میں لینا کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) یہ معنی سلفِ صالحین کے اجماع کے خلاف ہے۔ اولاً: علماءِ سلف میں سے کسی نے بھی یہ معنی نہیں کیا۔ ثانیاً: اللہ تعالیٰ کے خلق میں اختلاط وحلول کے انکار پر سب کا اجماع ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا مخلوق میں اختلاط وحلول، اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کے منافی ہے، حالانکہ اس

ذات کا علو کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف سے ثابت ہے۔

اب جو صفت اتنے ٹھوس دلائل سے ثابت ہے اس کے منافی ومخالف ہر معنی باطل ہوگا، اور یہ بطلان ان تمام دلائل سے ثابت ہوگا جن سے اس کے منافی صفت ثابت ہورہی ہے، تو چونکہ اللہ تعالیٰ کا علو کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف تمام دلائل سے ثابت ہے، لہذا اس کا اختلاط وحلول فی الخلق، کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف تمام دلائل سے باطل ہوگا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اختلاط وحلول کو مان لیں تو اس سے بہت سے ایسے امور لازم آتے ہیں جو باطل ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہیں۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی کما حقہ قدر بھی جانتا اور کرتا ہو، نیز اسے کلامِ عرب، کہ جس میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا، میں معیت کا معنی ومدلول بھی معلوم ہو، تو اس کیلئے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کی حقیقت یہ بتائے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے اندر موجود و مختلط ہے یا ان کے اماکن ومقامات میں حلول کیئے ہوئے ہے، وہ تو یہ بھی نہیں کہے گا کہ اس کی صفت معیت کا تقاضہ، اختلاط فی الخلق ہے چہ جائیکہ کہ صفتِ معیت کے اختلاط فی الخلق کے مستلزم ہونے کا عقیدہ رکھے، یہ تو ربّ جلّ وعلا کی عظمت سے جاہل ونا آشنا شخص ہی کا عقیدہ ہوسکتا ہے۔

جب اس قول کا بطلان واضح ہوگیا تو پھر یہ حقیقت متعین ہوجائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے معنی کے سلسلہ میں دوسرا قول حق ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ باعتبارِ علم، قدرت، سمع، بصر، تدبیر، بادشاہت اور شانِ ربوبیت کی دیگر متقاضیات کے ساتھ پوری خلق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، جبکہ اس کی ذاتِ اقدس پوری خلق کے اوپر عرش پر مستوی ہے۔

اس تقریر سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت پر مشتمل مذکورہ دونوں آیات کا بلاشبہ

یہی معنیٰ ظاہر ہے، کیونکہ یہ دونوں آیات حق ہیں اور حق کا معنیٰ ظاہر حق ہی ہوتا ہے، جبکہ قرآنِ مجید جو کتابِ حق ہے کے کسی لفظ کا معنی، معنیٰ باطل نہیں ہوسکتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۳/۵) میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی معیت کے باعتبارِ مقام وسیاقِ آیات، مختلف معانی واحکام ہیں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَايَخْرُجُ مِنْهَا وَمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَايَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت مذکور ہے اور سیاقِ آیت اور مناسبتِ مقام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں معیت کا معنی، حکم یا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر پوری پوری طرح مطلع، باخبر اور گواہ ہے، تمہارے تمام امور جانتا ہے اور تمہارا پوری طرح احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں سلفِ صالحین کے قول ''انه معهم بعلمه'' کا یہی معنی ومراد ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں معیت کا یہی معنی، معنیٰ ظاہر وحقیقی قرار دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل فرمان میں بھی سیاقِ آیت معیت کے اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ اِلَّاهُوَ رَابِعُهُمْ وَلَاخَمْسَةٍ اِلَّا هُوَسَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَااَكْثَرَ اِلَّاهُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَاكَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَاعَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (المجادلۃ:۷)

ترجمہ: (تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا

وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

اب صفتِ معیت کے سلسلہ میں قرآنِ مجید کا ایک اور مقام ملاحظہ فرمایئے، ہجرت کے موقعہ پر غارِ ثور میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رفیقِ سفر ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ﴾ (یعنی غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے)

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا ذکر ہے اور سیاقِ مقام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں معیت سے مراد، اللہ تعالیٰ کے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ نصرت اور تائید فرمانے کے بھی ہے۔

چونکہ سیاقِ آیت سے یہی معنی ثابت ہو رہا ہے لہذا یہاں یہی معنی، معنیٔ ظاہر و حق ہے۔

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں:

لفظِ معیت، قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر وارد ہوا ہے اور ہر مقام پر اس کا معنی و مقتضیٰ دوسرے مقام سے باعتبارِ سیاق مخالف ہوسکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لفظِ معیت کا استعمال جہاں جہاں ہوا ہے اگر ان تمام مقامات پر غور کریں تو معنوی اعتبار سے کوئی قدرِ مشترک ہو، لیکن ہر مقام پر باعتبارِ سیاق کوئی ایسی خاصیت ہو جو ایک جگہ کے معنی کو دوسری جگہ کے معنی سے ممتاز کردے۔

بہر حال دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، خلق میں مختلط نہیں ہے، اور یہ نتیجہ معنیٔ ظاہر سے ہرگز عدول نہیں ہے، کما تقدم۔

اس حقیقت کو مزید سمجھنے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ اپنی خلق کے ساتھ مختلط ہے اور بذاتہ ان کے درمیان موجود ہے، سورۃ المجادلۃ کی اس آیت پر کہ جس میں صفتِ معیت کا ذکر ہے دوبارہ غور کیجئے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ

اِلَّاھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَاخَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَسَادِسُھُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَااَکْثَرَ اِلَّاھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَاکَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَاعَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْئٍ عَلِیْمٌ﴾(المجادلۃ:۷)

ترجمہ: (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کی اور زمین کی ہر چیز سے واقف ہے، تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ معیت کا جب ذکر فرمایا تو آیت کے اول وآخر میں عمومِ علم کا تذکرہ فرمایا، چنانچہ آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ﴿اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ......﴾ بیان فرمایا اور آخر میں ﴿اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْئٍ عَلِیْمٌ﴾ بیان فرمایا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندوں کے ساتھ معیت کا معنی یہ نہیں کہ وہ بندوں میں مختلط ہے یا زمین پر انکے ساتھ اور انکے درمیان موجود ہے، بلکہ یہ معنی ہے کہ وہ بندوں کے تمام امور کا باعتبارِ علم احاطہ کیئے ہوئے ہے اور کسی بندے کا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں ہے۔

اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا ذکر ہے کے مکمل سیاق پر غور کیجئے:

﴿ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْھَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ أَیْنَ مَاکُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾(الحدید:۴)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی ہو گیا، وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو

کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ معیت کے ذکر سے قبل اپنے مستوی علی العرش ہونے کا ذکر فرمایا، نیز عمومِ علم کا بھی تذکرہ فرمادیا۔ اور آیت کے آخر میں یہ حقیقت بھی صراحتاً بیان فرمادی کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اب اس آیت کا معنیٰ ظاہر و حق کھل کر اور نکھر کر سامنے آگیا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے بندوں کا پورا علم ہے اور وہ ان کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذات مخلوقات میں سب سے بلند اپنے عرش پر مستوی ہے، لہٰذا نہ تو وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہے اور نہ ہی زمین کے اوپر ان کے درمیان موجود ہے۔ ورنہ یہ لازم آئے گا کہ یہ آیتِ کریمہ آپس میں بُری طرح متضاد و متناقض ہے، چنانچہ شروع کا حصہ اللہ تعالیٰ کے "علو" اور "استواء علی العرش" کا اعلان کر رہا ہے اور نعوذ باللہ آخری حصہ زمین پر موجود ہونے اور خلق کے ساتھ مختلط ہونے کا تذکرہ کر رہا ہے۔ (تعالیٰ اللہ عن ذلک علوا کبیرا)

بہرحال ہماری اس تقریر و توضیح سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ ہونے کا معنی و مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ ان کے تمام احوال سے باخبر ہے، ان کی ہر بات سنتا اور ہر فعل دیکھتا ہے، ان کے امور و حاجات کی تدبیر فرماتا ہے، زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، مالدار اور فقیر کرتا ہے، جس کو چاہے بادشاہت دے دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے، جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت عطا فرمادیتا ہے اور اسکے علاوہ وہ تمام امور انجام دیتا ہے جن کا اس کی شانِ ربوبیت و کمالِ بادشاہت تقاضہ کرتی ہے۔ اس کے اور اس کی خلق کے درمیان کوئی چیز حائل یا حاجب نہیں ہے۔ جس کے علم و احاطہ و قدرت کی یہ شان ہو تو وہ حقیقۃً خلق کے ساتھ ساتھ ہے اگرچہ وہ حقیقت میں سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے العقیدۃ الواسطیۃ (۱۴۲/۳)
میں صفتِ معیت پر کلام کیلئے ایک الگ فصل قائم کر کے فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا یہ تمام کلام کہ وہ اپنے عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے، حق ہے اور اپنی حقیقت پر قائم ہے، کسی تحریف کا محتاج نہیں ہے، البتہ اسے جھوٹے اور باطل افکار وظنون سے بچانا ضروری ہے (تا کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو جائے)

مزید الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۲/۵ ، ۱۰۳) میں فرماتے ہیں:

'' حاصلِ امر یہ ہے کہ کتاب وسنت سے مکمل ہدایت ونور حاصل ہوتے ہیں، بشرطیکہ انسان صرف کتاب وسنت ہی پر تدبر کرے، صرف اتباعِ حق اس کا مقصود ہو، نصوصِ کتاب وسنت میں ہر قسم کی تحریف، اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں ہر قسم کے الحاد کے ارتکاب سے اعراض واجتناب کرنے والا ہو۔

کوئی بھی شخص یہ سمجھنے کی کوشش وجسارت نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی (کتاب وسنت) میں آپس میں تناقض پایا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں وہ یہ مثال پیش کرے کہ کتاب وسنت میں یہ بات وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر مستوی ہے، یہ بات ظاہراً اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مخالف ومتعارض ہے: ﴿وهو معكم﴾ یعنی (وہ تمہارے ساتھ ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے خلاف ہے: [اذا قام أحدكم في الصلوة فان الله قِبَل وجهه] یعنی (جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے)

واضح ہو کہ ان نصوص میں دعویٰ تعارض باطل ومردود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونا بھی محمول برحقیقت ہے، اور اس ذاتِ وحدہ لاشریک کا مستوی علی العرش ہونا بھی محمول برحقیقت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانِ درج ذیل میں دونوں باتوں کو یکجا ذکر فرمایا ہے:

﴿هُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْهَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَاکُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾(الحدید:۴)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھرعرش پرمستوی ہوگیا، وہ خوب جانتا ہےاس چیز کوجوزمین میں جائے اور جواس سے نکلےاور جوآسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کراس میں جائے ،اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جوتم کررہے ہواللہ دیکھ رہاہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبردی ہے کہ وہ اپنے عرش کےاوپر ہے، کائنات کی ہر چیز کوجانتا ہے،اور ہم جہاں بھی ہوں ہمارے ساتھ ہے۔یہی بات حدیث الاوعال میں مذکور ہے[والله فوق العرش وهو يعلم ما أنتم عليه]یعنی (اللہ تعالیٰ عرش پرہےاورتمہارے ہر معاملےکوجانتا ہے)

واضح ہوکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت،اس حقیقت کے ساتھ،جیسی اس ذات کے لائق ہے،اپنے ظاہری معنی کے ساتھ،اللہ تعالیٰ کی ذات کے مستوی علی العرش ہونے کے متعارض ومتناقض نہیں ہے،اس کی تین وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ:اللہ تعالیٰ نے دونوں حقیقتوں کواپنی کتابِ مبین میں بیان فرمایاہے،کتابِ مبین ہرتناقض سے پاک ہے،ہماراایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں جن حقائق کا تذکرہ فرمایاہےان میں کوئی تناقض نہیں ہےاوراگرقرآنِ حکیم میں کسی مقام پرآپ کوبظاہرکوئی تناقض دکھائی دےتودعویٰ تناقض کےبجائے وہاں تدبروتفکر سےکام لوتاآنکہ تناقض دورہوجائے اورحق واضح ہوجائے،کیونکہ اللہ تعالیٰ نےفرمایاہے:

﴿اَفَلَایَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًاکَثِیْرًا﴾

ترجمہ: (یہ لوگ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بڑا اختلاف اور تناقض پاتے) (النساء:۸۲)

اور اگر تدبر کے باوجود مسئلہ کی حقیقت آپ پر واضح نہ ہو سکے تو راسخین فی العلم کا منہج اپنالو جو ایسے موقعہ پر وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن نے بتایا: ﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (ہم اس پر ایمان لاتے ہیں یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔)

چنانچہ اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو، جو کتاب کو نازل فرمانے والا ہے، اور جو حقیقی علم رکھتا ہے.....کمی اور کوتاہی آپ کے علم وفہم میں ہے (نہ قرآن مجید میں) قرآنِ حکیم تو ہر قسم کے تناقض سے پاک ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے قولِ مذکور میں ''کما جمع الله بينهما'' کہہ کر اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں خبر دی ہے کہ وہ اپنی خلق کے ساتھ ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ اپنے عرش پر مستوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید کی آیت میں ان دونوں حقیقتوں کا ذکر جمع فرما دیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور وہ اپنے عرش پر مستوی ہوا اور وہ اپنی خلق کے ساتھ ہے اس طرح کہ وہ اپنے عرش سے ان کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، جیسا کہ حدیث الاوعال میں ہے [اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر ہے اور تمہارے تمام امور کو دیکھ رہا ہے]

لہذا اللہ تعالیٰ کا علو (بلندی) پر ہونا، اسکے معیت مع الخلق کے متناقض نہیں اور اس کی معیت مع الخلق، اس کے علو کو باطل نہیں کرتا، بلکہ یہ دونوں حقیقتیں برحق ہیں۔ (مختصر الصواعق لابن الموصلی ص: ۴۱۰)

(۲) دوسری وجہ: معیت کا معنی حقیقۃً علو کے متناقض نہیں ہے، بلکہ معیت اور علو دونوں کا جمع ہونا ممکن ہے، بلکہ ایک مخلوق کے لیئے بھی ممکن ہے کہ اس میں معیت اور علو یکجا ہو جائیں۔ جیسے

کہا جاتا ہے: ''مازلنا نسیر والقمر معنا ''(ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ تھا)(حالانکہ چاند تو اوپر ہوتا ہے۔) یہاں کوئی تناقض بھی نہیں ہے، اور نہ ہی چاند کے ہمارے ساتھ ہونے کا یہ معنی ہے کہ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ تو جب ایک مخلوق کے حق میں ان دونوں حقیقتوں کا جمع ہونا ممکن ہے تو پھر وہ خالق جو کائنات کی ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے اور سب سے بلندی پر اپنے عرش پر مستوی ہے، کے حق میں تو یہ دونوں حقیقتیں بالاولیٰ اکٹھی ہوسکتی ہیں...... پھر ہمیں یہ بات بخوبی معلوم ہوچکی ہے کہ معیت کا معنی وحقیقت قطعاً اس بات کی متقاضی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ معیت ہو اس کے ساتھ ایک جگہ جمع ہونا ضروری ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۲/۵) میں اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے '' لفظ ''مع ''یعنی (ساتھ ہونا) جب استعمال کیا جائے گا تو لغت میں اس کا ظاہری معنی مطلقاً مقارنت ومصاحبت ہی ہوگا، جس کے ساتھ معیت، مذکور ہو اسے چھونا یا اسکے دائیں یا بائیں (یا آگے پیچھے) ہوکر اس سے مختلط ہونا ضروری نہیں ہے۔ جب سیاقِ کلام کے پیشِ نظر لفظِ ''مع'' کے کسی معنی کو مقید کیا جائے گا تو اسی معنی کی مقارنت مراد ہوگی۔ کہا جاتا ہے: ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ رہا، یا فلاں ستارہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ اسی طرح اپنا سامان اگرچہ آپ نے اپنے سر کے اوپر اٹھا رکھا ہو مگر آپ کہتے ہیں: ''ھذا المتاع معی ''(یہ سامان میرے ساتھ ہے) لہذا اللہ تعالیٰ حقیقتاً اپنی خلق کے ساتھ بھی ہے اور حقیقتاً اپنے عرش کے اوپر بھی ہے۔ ''

اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام پر کروڑوں رحمتیں برسائے انہوں نے بالکل سچ فرمایا: جو رب تعالیٰ، آپ کا مکمل علم رکھتا ہے، پوری طرح آپ پر مطلع اور محیط ہے، آپ کی ہر بات سنتا اور ہر فعل دیکھتا ہے، اور آپ کے ہر معاملے کی تدبیر فرماتا ہے، وہ درحقیقت آپ کے ساتھ ہی ہے، اگرچہ وہ حقیقتاً اپنے عرش کے اوپر ہے کیونکہ معیت ایک جگہ اکٹھا ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔

(۳) تیسری وجہ: اگر معیت (ساتھ ہونا) اور علو (بلند ہونا) ہر دو صفات کے مخلوقین کے حق میں جمع ہونا ناممکن مان لیں تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ یہ دونوں حقیقتیں خالق کے حق میں بھی جمع نہیں ہوسکتی، وہ خالق جس نے خود ان دونوں صفات کو اپنے لیئے بیان فرمایا ہے، کیونکہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کی مماثلت نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ کے العقیدہ الواسطیۃ (۱۴۲/۳) میں اسی نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے: '' قرآن وحدیث میں جو اللہ تعالیٰ کا قرب ومعیت مذکور ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ''علو'' و''فوقیت'' کے منافی نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات میں اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں ہے، وہ ذات قریب ہونے کے باوجود علو وبلندی پر ہے اور بلند ہونے کے باوجود قریب اور نزدیک ہے۔

تتمۂ بحث: اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت کے سلسلہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں

(۱) وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ مخلوقات کے امور واحوال کا علم واحاطہ رکھنے والا ہے، یہ معیتِ عامہ ہے۔ دوسرا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں کی نصرت وتائید فرماتا ہے، یہ معیتِ خاصہ ہے۔ ان ہر دو معانی کے اپنے اپنے محل میں اقرار واثبات کے ساتھ ساتھ اس بات کا اقرار واثبات بھی ضروری ہے کہ وہ بذاتہ سب سے بلند ہے اور اپنے عرش پر مستوی ہے۔ یہ سلفِ صالحین کا عقیدہ ہے اور یہی مذہبِ حق ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دلائل کے ساتھ بیان ہوا۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق کے ساتھ معیت کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زمین پر ان کے ساتھ موجود ومختلط ہے...... یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علو اور استواء علی العرش کی نفی کرتے ہیں...... یہ قدیم جہمیہ حلولیہ وغیرہ کا عقیدہ ہے۔ ان کا مذہب باطل اور انتہائی بدترین ہے، تمام سلفِ صالحین کا اس کے بطلان وانکار پر اجماع ہے۔ (کما تقدم)

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق کے ساتھ معیت کا معنیٰ ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زمین پر ان کے ساتھ موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا اپنے عرش پر علو بھی ثابت ہے۔ یہ بات شیخ الاسلام نے مجموع الفتاویٰ (۲۲۹/۵) میں بعض لوگوں کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔

ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے صفتِ معیت اور صفتِ علو، ہر دو کے نصوص کے معنیٰ ظاہر کو لیا ہے۔ یہ لوگ جھوٹے اور گمراہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معیت کے نصوص قطعاً اس کے حلول فی المخلوق، جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں کے متقاضی نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ باطل ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کا معنیٰ ظاہر کبھی باطل نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ: واضح ہو کہ علماءِ سلف سے اللہ تعالیٰ کی معیت کی تفسیر ان الفاظ میں منقول ہے:

''انه معهم بعلمه''یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے علم کے اعتبار سے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف از روئے علم ساتھ ہے، بلکہ ربوبیت کے تمام معانی مثلاً: احاطہ، سمع، بصر، قدرت اور تدبیر وغیرہ کے ساتھ ہے۔

ایک اور تنبیہ: گزشتہ صفحات میں ہم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علو قرآن، حدیث، عقل، فطرت اور اجماع تمام دلائل سے ثابت ہے (ہم اس کی قدرے تفصیل عرض کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا علو (بلند ہونا) قرآنِ حکیم میں مختلف اور متنوع اسالیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

کہیں تو لفظِ ''العلو ''استعمال ہوا، جیسے ﴿وَهُوَ العَلِىُّ الْعَظِيْمُ﴾ (الشوریٰ:۴)

ترجمہ: (وہ بلند اور عظیم ہے)

کہیں لفظِ ''فوق ''مستعمل ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ (الانعام:۶۱)

ترجمہ: (اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے)

کہیں ''استواء علی العرش'' کا ذکر کر کے اس کے علو کو بیان کیا گیا: جیسے

﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ (طٰہٰ:۵)

ترجمہ: (جو رحمٰن ہے عرش پر قائم ہے)

کہیں اللہ تعالیٰ کا آسمانوں پر ہونا مذکور ہے: ﴿ءَ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ﴾ (الملک:۱۶)

ترجمہ: (کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ جو ذات آسمان پر ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے)

کہیں اسکے علو کا اس طرح تذکرہ ملتا ہے کہ مختلف چیزیں اسکی طرف اوپر چڑھ کر جاتی ہیں:

﴿اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ﴾ (القاطر:۱۰)

ترجمہ: (تمام تر ستھرے کلمات اس کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے)

﴿ تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ اِلَیۡہِ﴾ (المعارج:۴)

ترجمہ: (جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں)

﴿اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ﴾ (آل عمران:۵۵)

ترجمہ: (جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں)

کہیں اس کے علو کا ذکر اس طرح ہوا کہ مختلف چیزیں اس کی طرف سے نیچے آتی ہیں:

﴿قُلۡ نَزَّلَہٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّکَ﴾ (النحل:۱۰۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل لے کر آئے ہیں)

﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ﴾ (السجدۃ:۵)

ترجمہ: (وہ آسمان سے لیکر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے)

احادیث میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کا بیان موجود ہے، چنانچہ اس موضوع پر مختلف اسالیب کے ساتھ قولی، فعلی اور تقریری ہر قسم کی اتنی احادیث موجود ہیں کہ ان کا مجموعہ حدِ تواتر کو پہنچتا ہے۔ جیسے:

نبی ﷺ کی سجدہ کے اندر دعا: [سبحان ربی الاعلیٰ]

(پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند ہے) (مسلم مع النووی (۵/۲۳)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [ان اللہ لما قضی الخلق کتب عندہ فوق عرشہ :ان رحمتی سبقت غضبی] یعنی (اللہ تعالیٰ نے جب خلق کی تخلیق کا فیصلہ فرمایا تو عرش پر اپنے پاس یہ لکھا: بےشک میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی) (متفق علیہ)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی اللہ تعالیٰ کے علو پر دال ہے: [ألا تأمنونی وأنا أمین من فی السماء] (صحیح بخاری مع الفتح (۷/۶۶۶)

یعنی (تم مجھے امین کیوں نہیں مانتے، حالانکہ میں آسمان والی ذات کا امین ہوں)

نبی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: [اللهم أغثنا] (اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما) (مسلم مع النووی (۷/۱۹۲)

یومِ عرفہ میں آپ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے لوگوں سے پوچھا: کیا میں نے پورا دین پہنچا دیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پورا دین پہنچا دیا، امانت اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: [اللهم اشهد] (اے اللہ! تو گواہ رہ) (بخاری مع الفتح (۲/۵۸۵) مسلم مع النووی (۸/۱۸۴)

آپ ﷺ نے لونڈی سے پوچھا: [این اللہ؟] (اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟) اس نے جواب دیا: [فی السماء] (آسمان کے اوپر) تو آپ ﷺ نے اس کی اس بات کی تقریر و تائید فرمائی اور اس کے آقا سے کہا [اعتقها فانها مؤمنة] (اسے آزاد کردو یہ مؤمنہ ہے) (مسلم مع النووی (۵/۲۴)

جہاں تک دلیلِ عقل سے صفتِ علو کے ثبوت کا تعلق ہے تو عقل کی دلالت وشہادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے وجوباً ہر صفتِ کمال کا اثبات ہو اور ہر صفتِ نقص سے اس کی تنزیہ اور پاکیزگی ہو......اور ظاہر ہے، علو صفتِ کمال ہے، اور سفل (نیچائی) صفتِ نقص۔ لہذا یہ بات متعین ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ علو کا اثبات واجب ہے، اور اس کا نقیض یعنی سفل کی نفی ضروری ہے۔

فطرت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے بدیہی طور پر صفتِ علو کے اثبات پر دال ہے، چنانچہ کوئی بھی دعا کرنے والا یا پریشان حال جب اپنے پروردگار کی طرف لاچار ہوتا ہے تو وہ اوپر کی طرف کیوں دیکھتا ہے؟ اس موقعہ پر وہ دائیں یا بائیں کیوں التفات نہیں کرتا؟ اس کے دل میں بداهۃً توجہ الی العلو کا خیال راسخ ومرتکز ہوتا ہے۔ نمازیوں سے پوچھو کہ سجدہ میں [سبحان ربی الاعلیٰ] کہتے ہوئے تمہارے دلوں کا اتجاہ کس طرف ہوتا ہے؟۔

جہاں تک دلیلِ اجماع کا تعلق ہے تو تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر مستوی ہے، اس بارہ میں ان کا کلام نصاً وظاہراً موجود ہے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں: ''کنا والتابعون متوافرون نقول ان اللہ تعالی ذکرہ فوق عرشہ ونؤمن بما جاء ت بہ السنة من الصفات''[1]

یعنی (ہم تابعین کی کثیر تعداد کی موجودگی میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے اوپر ہے، نیز ہم احادیثِ رسول ﷺ سے ثابت اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر ایمان لاتے ہیں)

بہت سے اہلِ علم نے اس پاکیزہ عقیدہ پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور اس بارہ میں کسی کا مخالفت کرنا محال ہے، جبکہ اس عقیدۂ مبارکہ کو بڑے عظیم دلائل کی تائید ومطابقت بھی حاصل ہے۔

---

[1] اس اثر کو امام بیہقی نے ''الاسماء والصفات'' (۲/۱۵۰) اور الذہبی نے ''السیر'' (۷/۱۲۰، ۱۲۱) اور تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۸۱، ۱۸۲) میں ذکر کیا ہے، امام ذھبی نے اس اثر کو صحیح کہا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ''الحمویۃ'' اور ابن القیم نے ''اجتماع الجیوش'' میں صحیح کہا ہے۔

ان دلائل کا وہی شخص انکار کرسکتا ہے جس میں کبر وطغیان کا عنصر ہو، جس کی بصیرتِ قلب مطموس ومشبوہ ہواور جسے، شیاطین فطرتِ سلیمہ سے محروم ومنحرف کر کے اپنے ناپاک چنگل میں پوری طرح پھانس لیں۔ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت وسلامتی کا سوال کرتے ہیں۔

تیسری تنبیہ: قارئینِ کرام! ایک مجلس میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی اپنے خلق کے ساتھ اپنی معیت کے حوالے سے گفتگو کی، جسے بعض طلباء نے تحریر کردیا، پھر وہ تحریر منظرِ عام پر آگئی، اس وقت ہم نے اللہ تعالیٰ کی معیت کے بارہ میں یہ بتلایا:

'' ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت حقیقی اور ذاتی ہے، ایسی معیت جو اسکی شانِ باکمال کے لائق ہے اور ایسی معیت جو اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ باعتبارِ علم، قدرت، سمع، بصر، بادشاہت اور تدبیر ہر شیٔ کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہو یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہو، بلکہ وہ اپنی ذات اور صفات کے ساتھ بلند ہے، اور بلندی پر ہونا اس کی وہ صفتِ ذاتیہ ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہوتی، اور وہ عرش پر مستوی ہے جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، اور اس کا سب سے بلندی پر، عرش پر مستوی ہونا معیت مع الخلق کے منافی نہیں ہے، کیونکہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

(اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے دیکھنے والا ہے)''

واضح ہو کہ ہمارے اس بیان میں اللہ تعالیٰ کی معیت کیلئے ''ذاتی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے ہمارا مقصود صرف حقیقتِ معیت کی تاکید تھا، یہ مقصود ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ زمین پر اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔(جیسا کہ حلولیہ کا عقیدہ ہے) ہم نے اسی بیان میں آگے ذکر کیا ہے کہ:......اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہو یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہو، بلکہ وہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ بلند ہے اور بلندی پر ہونا اس کی وہ

صفتِ ذاتیہ ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہوتی اور وہ عرش پر مستوی ہے.....الخ

اسی بیان میں، میں نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا:

'' ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر جگہ ہے تو اگر یہ اس کا عقیدہ ہے تو وہ کافر اور گمراہ ہے اور اگر اس عقیدہ کو سلفِ صالحین یا ائمہ کرام کی طرف منسوب کرتا ہے تو انتہائی جھوٹا ہے۔ ''

ایک سمجھدار آدمی جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو اور کما حقہ اس کی قدر بجالاتا ہو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اپنی خلق کے ساتھ ہے۔ میں اپنی ہر مجلس میں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت پر گفتگو آجائے اس کا انکار کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہونگا، میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے تمام مسلمان بھائیوں کو دنیا اور آخرت میں کلمۂ توحید پر ثابت قدمی عطا فرمائے۔

اس کے بعد میں نے ایک مقالہ بھی تحریر کیا جو ریاض سے شائع ہونے والے مجلۃ ''الدعوۃ'' میں بروز پیر ۴ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ شمارہ نمبر ۹۱۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں میں نے وہی کچھ لکھا اور ثابت کیا جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت حق ہے اور حقیقت پر قائم ہے، لیکن وہ متقاضی حلول واختلاط بالخلق نہیں ہے چہ جائیکہ مستلزمِ حلول واختلاط ہو۔ اس مقالہ میں میں نے اللہ تعالیٰ کے علو کی حقیقت اور معیت مع الخلق کی حقیقت میں جمع کی وجوہات بیان کی ہیں۔ میں نے اپنی اس تحریر میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ میں اپنی سابقہ تحریر میں سے لفظ ''ذاتی'' ہٹانا ضروری سمجھتا ہوں (کیونکہ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت بذاتہ ہے، جو قطعاً ہمارا مقصود نہیں)

واضح ہو کہ ہر وہ لفظ جو اللہ تعالیٰ کے بذاتہ زمین پر ہونے یا مخلوقات کے ساتھ مختلط ہونے، یا اس کے علو اور استواء علی العرش کی نفی کرنے پر منتج یا مستلزم ہو وہ باطل ہے، اس کا رد اور انکار

ضروری ہے، کہنے والا کوئی بھی ہو اور وہ جو لفظ بھی کہہ جائے۔

ہر وہ کلام جو خواہ بعض افراد کو ہی، اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارہ میں مبتلائے وہم کردے اس سے بچنا ضروری ہے، تا کہ ایک شخص بھی اس کے اُس ایک لفظ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ظنِ سوء میں گرفتار نہ ہو جائے......لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارہ میں جو کچھ بھی اپنی کتابِ مقدس میں ثابت فرمایا، یا اپنے پیارے رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا اس کا اثبات فرض ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اوہام وشبہات پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف نامناسب اور غیر لائق عقائد منسوب کرنے والوں کا رد اور ان کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔(و اللہ المستعان)

ساتویں اور آٹھویں مثال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَحنُ أَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾(ق:١٦)

ترجمہ: ((اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں))

نیز فرمایا: ﴿وَنَحنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ﴾(الواقعۃ:٨٥)

ترجمہ: (ہم اس شخص سے بہ نسبت تمہارے، بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں)

یہاں ''قرب'' سے ملائکہ کا قرب مراد لیا گیا ہے(جو ظاہر سے عدول قرار پائے گا)

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تدبر و تفکر سے کام لیں تو یہاں قرب سے مراد ملائکہ ہی کا قرب ہے، اور ملائکہ کا قرب مراد لینا، معنیٰ ظاہر سے انحراف نہیں ہے(بلکہ ظاہرِ سیاق کا عین مقتضیٰ یہی ہے)

پہلی آیتِ کریمہ میں قرب، ایک ایسی قید کے ساتھ مقید ہے جس سے صراحۃً قربِ ملائکہ ظاہر ہو رہا ہے، پوری آیتِ کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

﴿نَحنُ أَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ. اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ. مَايَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّالَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾(ق:١٦تا١٨)

ترجمہ: (اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں، جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے، انسان منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر کہ اس کے پاس نگہبان تیار ہے)

ان آیاتِ مبارکہ میں قولہ تعالیٰ ﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد ملنے والے دو فرشتوں (یعنی کراماً کاتبین) کا قرب ہے۔

دوسری آیت میں جس قرب کا ذکر ہے، وہ اس شخص کی حالت کے بیان کے ساتھ مقید ہے جس پر سکرات الموت طاری ہو جائیں، اور ظاہر ہے کہ سکرات الموت کے وقت ملائکہ ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾ (الانعام: ۶۱)

ترجمہ: (یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے تو اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کر لیتے ہیں، اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے)

علاوہ ازیں مذکورہ آیت میں قولہ تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ بھی قابلِ غور ہے، جو کہ اس بات کی بڑی صریح اور بین و واضح دلیل ہے کہ یہاں قرب سے ملائکہ کا قرب مراد ہے، کیونکہ ذکر یہ ہو رہا ہے کہ وہ چیز جس کے قرب کا ذکر ہو رہا ہے وہ اسی مقام پر موجود ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں کی جا سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں کہنا امرِ محال ہے، لہٰذا یہ بات متعین ہو گئی کہ یہاں ملائکہ کا قرب ہی بیان ہوا ہے۔

ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر یہ قرب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا ہے؟ اور کیا اس قسم کی تعبیر قرآنِ حکیم میں اور کسی مقام پر ذکر ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا قرب اپنی طرف اس لیئے منسوب فرمایا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہی قریب ہوتے ہیں، اور کیوں نہ؟ ملائکہ اللہ تعالیٰ ہی کا لشکر اور اس کے

نمائندے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر کئی مقام پر مذکور ہے (یعنی فعلِ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا)

کقولہ تعالیٰ: ﴿فَإِذَا قَرَأْنَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ (القیامۃ:١٨)

ترجمہ: (ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں)

یہاں قرأت سے مراد جبرائیلِ امین کی قرأت ہے، جو وہ انزالِ وحی کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ پر فرمایا کرتے تھے، حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، تو چونکہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے امر سے قرأت فرماتے تھے، لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی قرأت کی نسبت واضافت صحیح ٹھہری۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ﴾ (ھود:٧٤)

ترجمہ: (جب ابراھیم کا ڈر وخوف جاتا رہا اور اسے بشارت بھی پہنچ چکی تو ہم سے قومِ لوط کے بارہ میں جدال (جھگڑہ) کرنے لگے)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراھیم علیہ السلام کے جدال اور جھگڑنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، حالانکہ انہوں نے ملائکہ کے ساتھ جدال کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور ایلچی کی حیثیت سے بشارت لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

نویں اور دسویں مثال:

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے سفینہ کے بارہ میں فرمایا تھا: ﴿تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا﴾

ترجمہ: (جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی) (القمر:١٤)

نیز موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي﴾ (طٰہ:٣٩)

ترجمہ: (تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے)

جواب: ان دونوں آیتوں کا معنی ومراد ظاہرِ کلام اور حقیقت پر مبنی ہے، لیکن غور یہ کرنا ہے کہ یہاں ظاہرِ کلام کیا چیز ہے؟ کیا ظاہرِ کلام یہ ہے کہ سفینۂ نوح اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں چل رہا تھا؟ اور موسیٰ علیہ السلام کی پرورش اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے اوپر ہو رہی تھی؟ یا پھر ظاہرِ کلام یہ ہے کہ سفینۂ نوح چل رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی آنکھ اس کی نگرانی وحفاظت فرما رہی تھی، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی پرورش وکفالت اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے سامنے اس کی نگرانی وحفاظت میں ہو رہی تھی۔

ان دونوں آیتوں کی ذکر کردہ پہلی تفسیر باطل ہے، اور اسکی دو وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ تعبیر کلام عرب، یا عربی تعبیر کے مقتضیٰ کے خلاف ہے، اور ظاہر ہے قرآنِ مجید عربی لغت میں نازل ہوا ہے۔ کقولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یوسف:۲)

ترجمہ: (یقیناً ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل فرمایا ہے، کہ تم سمجھ سکو)

نیز فرمایا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء:۱۹۳تا۱۹۵)

ترجمہ: (اسے امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے، آپ کے دل پر اتارا ہے، کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں، صاف عربی زبان میں ہے)

اب عربی لغت میں اگر کوئی شخص کہے: ''فلان يسير بعيني'' تو اس کا معنی کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھے گا کہ فلاں اس کی آنکھ کے اندر چل رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یوں کہے: ''فلان تخرج على عيني'' تو کوئی شخص یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ سوار ہو کر اس کی آنکھ کے اوپر جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہاں ظاہرِ خطاب کا یہی تقاضا ہے تو اس بات سے بے وقوف سے بے وقوف شخص ہنسے گا، عقلاء کی تو بات ہی چھوڑ یئے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ معنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے حق میں بالکل محال وممتنع ہے؛ کیونکہ

جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی کما حقہ قدر بجالاتا ہے، ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں اس قسم کا فہم رکھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے اور اپنی مخلوق سے بالکل جدا ہے، نہ تو اس کی مخلوقات میں سے کوئی اس کے اندر حلول کر سکتا ہے، نہ وہ کسی کے اندر حلول کیئے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ پاک ہے اور ان چیزوں سے، بہت بلند ہے۔

جب لفظی ومعنوی اعتبار سے اس حقیقت کا بطلان ثابت ہوگیا تو پھر دوسری ذکر کردہ حقیقت متعین ہوگئی، وہی ان دونوں آیتوں کا معنیٰ ظاہر قرار پائے گی۔ یعنی (۱) سفینۂ نوح چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی آنکھ اس کی دیکھ بھال اور حفاظت فرما رہی تھی۔ (۲) اور موسیٰ علیہ السلام کی پرورش وکفالت اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے سامنے اس طرح ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت فرما رہا تھا۔

بعض سلفِ صالحین سے ان آیتوں کی تفسیر ''بـمـرأى مـنـي ''منقول ہے، جس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر تحریر کیا، کیونکہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی آنکھ سے ان کی نگرانی وحفاظت فرما رہا تھا تو اس کا لازمی تقاضہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا تھا، کسی بھی لفظ کے معنیٰ صحیح سے جو بھی چیز لازم آئے وہ صحیح قرار پاتی ہے، الفاظ کی دلالت مطابقی یا تضمنی یا التزامی کی معرفت رکھنے والوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے۔

گیارہویں مثال: ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان منقول ہے:

[ومـايـزال عبـدي يتـقـرب الـي بالنوافل حتى أحبه فاذا أحببته كنت سمعه الـذي يسـمـع به وبصره الذي يبصر به ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بهاولئن سألني لاعطينه ولئن استعاذني لاعيذنه] (صحیح بخاری۶۵۰۲)

ترجمہ: [اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں

جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، پھر وہ مجھ سے جو کچھ مانگے گا عطا کرونگا، اور اگر میری پناہ طلب کرے گا تو پناہ دے دونگا۔](یہ حدیث صحیح بخاری، باب التواضع میں مروی ہے جو کہ کتاب الرقاق کا ۳۸واں باب ہے)

جواب: سلف صالحین اہل السنۃ والجماعۃ نے اس حدیث کے ظاہر کولیا ہے، (یعنی بلاتاویل قبول کیا ہے،) اور اسے اس کی حقیقت پر محمول کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں ظاہر حدیث کیا ہے؟ کیا ظاہرِ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کا کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہے؟ یا ظاہرِ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو اس قدر سیدھا کردیتا ہے کہ ان اعضاء سے اس کا کیا گیا ہر عمل، بلکہ اس کا مکمل شعور وادراک اللہ تعالیٰ کیلئے ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد پر قائم ہوجاتا ہے، اور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہوجاتا ہے۔

پہلا قول ظاہرِ حدیث نہیں ہوسکتا، بلکہ حدیث کے سیاق پر غور کرنے والا سمجھ جائے گا کہ پہلا قول اس حدیث کا مقتضیٰ بنتا ہی نہیں، چنانچہ حدیث کے اندر ہی اس قول کی نفی دو وجوہ سے موجود ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ اس حدیث کا اول حصہ یوں ہے: [اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں] اور آخری حصہ میں یہ الفاظ مروی ہیں: [اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے گا تو میں اسے ضرور عطا فرماؤنگا اور اگر میری پناہ طلب کرے گا تو میں اسے ضرور پناہ عطا فرماؤنگا] اس حدیث سے دو ذاتیں ثابت ہورہی ہیں۔

ایک عبد (بندہ) اور دوسری معبود۔

ایک متقرِب (قرب حاصل کرنے والا) دوسرا متقرَّب إلیہ (جس کا قرب حاصل کیا جائے)

ایک محب (محبت کرنے والا) دوسرا محبوب (جس سے محبت کی جائے)

ایک سائل (مانگنے والا) دوسرا مسئول (جس سے مانگا جائے)

ایک معطیٰ (جسے دیا جائے) دوسرا معطِی (دینے والا)

ایک مستعیذ (پناہ طلب کرنے والا) دوسرا مستعاذ به (جس سے پناہ طلب کی جائے)

ایک معاذ (جسے پناہ دی جائے) دوسرا معیذ (پناہ دینے والا)

گویا سیاقِ حدیث سے دو جدا ذاتیں ثابت ہورہی ہیں، جن میں سے ہر ذات دوسرے کی غیر ہے۔ جب دو ذاتیں اس قدر جدا اور متباین ہونگی تو پھر ایک ذات، دوسری ذات کا کوئی وصف یا جزء کیسے بن سکتی ہے؟ یہ امرِ ممتنع ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ولی کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں ایک مخلوقِ حادث کے اوصاف یا اجزاء ہیں، جو پہلے معدوم تھا، بعد میں وجود میں آیا۔ کوئی دانا انسان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اس خالق کو کہ جو ازل سے ہے اور جس سے قبل کوئی چیز نہیں تھی، مخلوق کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں قرار دے۔ بلکہ اس فاسد معنی کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے زبان گنگ ہوجاتی ہے اور بولنے کی صلاحیت کھوبیٹھتی ہے۔ خواہ یہ معنی بفرضِ محال تھوڑی دیر کیلئے ہی مراد لیا جائے...... تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس معنی کو اس حدیثِ قدسی کا ظاہر قرار دیا جائے، اور سلفِ صالحین کے بیان کردہ صحیح معنی کو معنیٔ ظاہر سے انحراف قرار دیا جائے؟ اے اللہ تو پاک ہے، تیری ہی حمد و بادشاہت ہے، ہم تیری ثناء بیان نہیں کرسکتے، جسطرح کہ تو نے اپنی ثناء بیان فرمائی ہے۔

اس حدیث کے معنی میں ذکر کردہ جب پہلے قول کا باطل و ممتنع ومحال ہونا ثابت ہوگیا تو پھر دوسرا قول متعین ہوگیا، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کو اس کے سمع، بصر اور ہر عمل میں اس قدر سیدھا پن واصلاح واستقامت عطا فرمادیتا ہے، کہ اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کے ہر عمل میں اس کا ادراک ازروئے اخلاص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوجاتا ہے، اور ازروئے استقامت

اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوجاتا ہے اور ازروئے شریعت واتباع اللہ تعالیٰ کی راہ میں بن جاتا ہے، چنانچہ اسے کمال درجے کا اخلاص، استقامت اور متابعت بصورتِ تمام میسر آجاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ درجے کی توفیق شمار ہوتی ہے۔

سلفِ صالحین سے یہی تفسیر منقول ہے، جو ظاہرِ حدیث کے عین مطابق، حقیقتِ حدیث کے عین موافق اور سیاقِ حدیث کیلئے بالکل متعین ہے۔اس میں نہ کسی قسم کی تاویل کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ ہی معنیٔ ظاہر سے انحراف اختیار کیا گیا ہے۔(وللہ الحمد والمنۃ)

بارھویں مثال: رسول اللہ ﷺ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل فرماتے ہیں:

[من تقرب مني شبرا تقربت منه ذراعا ومن تقرب مني ذراعا تقربت منه باعاومن أتاني يمشي أتيته هرولة]

ترجمہ: [جو شخص بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاؤنگا، اور جو ایک ہاتھ قریب آئیگا میں ایک گز اس کے قریب ہو جاؤنگا، اور جو میرے پاس چل کر آئے گا میں اس کی طرف دوڑ کر جاؤنگا]

یہ حدیث صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے، امام مسلم نے اس معنی کی روایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت فرمائی ہے، جبکہ صحیح بخاری، کتاب التوحید کے پندرھویں باب میں اسی قسم کی ایک حدیث بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہے۔

یہ حدیث دیگر نصوص کی طرح اللہ تعالیٰ کے چند افعالِ اختیاریہ پر مشتمل ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' ہے (یعنی جو ارادہ فرمائے وہی کرتا ہے) کتاب وسنت کے بہت سے نصوص میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے افعالِ اختیاری مذکور ہیں: مثلاً: اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّى قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾

ترجمہ: (جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں) (۱۸۶/۲)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر:۲۲)

ترجمہ: (اور تیرا رب (خود) آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر (آجائیں گے)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِىَ رَبُّكَ أَوْ

يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّکَ ......﴾(الانعام:۱۵۸)

ترجمہ:(کیا یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آئے؟)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾(طہ:۴)

ترجمہ:(رحمٰن ہے، عرش پر مستوی ہوا)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[ینزل ربنا الی سماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الآخر]

ترجمہ:[جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا پروردگار آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[ماتصدق أحد صدقة من طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب الا أخذ ھا الرحمن بیمینه]

ترجمہ:[جو کوئی شخص کسبِ حلال سے صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ صرف کسبِ حلال ہی قبول فرماتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے......]

اس کے علاوہ بہت سی آیات واحادیث ہیں جن میں اللہ رب العزت کے چند افعالِ اختیاریہ انجام دینے کا ذکر ہے۔

واضح ہو کہ مذکورہ بالا حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کے دو افعال کا ذکر ہے،(ایک اس کا بندوں کے قریب ہونا، دوسرا اس کا بعض بندوں کی طرف دوڑنا) یہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔سلفِ صالحین اہل السنۃ والجماعۃ اس قسم کے نصوص کو ان کے ظاہری وحقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں، وہ معنی جو اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان ہے، جو ہر قسم کی تکییف (بیانِ کیفیت) اور تشبیہ وتمثیل سے پاک ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۴۶۶/۵) میں حدیثِ نزول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اللہ رب العزت کا اپنے بعض بندوں کے قریب ہونا،اللہ رب العزت کی وہ صفت ہے جو دیگر افعالِ اختیاریہ مثلاً: اللہ تعالیٰ کا آنا،اللہ تعالیٰ کا نزول فرمانا،اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا،کی طرح اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے،اور یہ کہ اللہ رب العزت اپنے افعالِ اختیاریہ خود انجام دیتاہے،سلفِ صالحین،معروف أئمہ اسلام اور اہل الحدیث کا یہی مذہب ہے،اور اس حوالے سے ان کے اقوال تواتر کے ساتھ منقول ہیں "

اب وہ کون سا مانع ہے جواللہ رب العزت کے اپنے بندے کے قریب ہونے میں رکاوٹ بنے،اللہ تعالیٰ اپنے علو پر قائم رہتے ہوئے ،جس طرح چاہے اپنے بندے کے قریب ہو جائے۔اسی طرح وہ کون سا مانع ہے جواللہ تعالیٰ کی صفت"اتیـان ، مجـی""(یعنی آنے) سے مانع ہو؟اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے(جیسے اس ذات کے لائق ہے) آتا ہے،ہم اس کے آنے کی نہ تو کیفیت بتلا سکتے ہیں،نہ اس کے آنے کو کسی مخلوق کے آنے کے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔

ان صفات کا اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ عین اللہ تعالیٰ کے کمال کا مظہر ہیں،اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ "فَعَّالٌ لِمَا یُرِیْدُ "یعنی جو چاہتا ہے کر لیتا ہے،بالکل اس طریقہ سے جو اس ذاتِ پاک کے لائق اور شایانِ شان ہو۔

کچھ لوگ مذکورہ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کے فرمان:[أتیتـــه هـــرولة]یعنی میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں،سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر جلد متوجہ ہونا اور جلدی سے دعا قبول کرنا،لیتے ہیں۔یہ اس بندے کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی اور طلبگار ہے،اور اس کے لیئے اپنے دل اور تمام اعضاء کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہے،چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو اس کے عمل سے کہیں بڑھ کر بڑی تیزی کے ساتھ جزاء عطا فرما دیتا ہے۔

انہوں نے اپنے اس معنی ومراد کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے حوالے سے بھی یوں فرمایا ہے:[ومـن اتـانـی یمشـی] کہ جو میرے پاس چل کر آئے گا۔اور یہ بات

معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی اور اس کے وصل کا طالب، اس قرب ووصل کو محض قدموں سے چل کرنہیں پاتا۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات چلنا باعثِ اجروثواب ہوتا ہے، جیسا کہ مساجد کی طرف چل کر جانا، مشاعرِ حج اور جہادِ فی سبیل اللہ کیلئے چلنا وغیرہ۔لیکن اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے اور بھی بہت سے ذرائع ووسائل ہیں، مثلاً: رکوع وسجود وغیرہ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[إن اقرب مايكون العبد من ربه وهو ساجد]

ترجمہ:[بندہ سب سے زیادہ اپنے پروردگار کا قرب اس وقت پاتا ہے جب وہ سجدے میں ہو]

بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا قرب ووصل ایک قدم چلے بغیر، بستر پر لیٹے لیٹے حاصل ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

ترجمہ:(جواللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

[صل قائما فان لم تستطع فقاعدافان لم تستطع فعلى جنب]

یعنی[تم کھڑے ہوکر نماز پڑھواور اگر کھڑے ہونے کی استطاعت نہ ہوتو بیٹھ کر پڑھ لواور اگر بیٹھ کر پڑھنے کی بھی طاقت نہ ہوتو پہلو کے بل لیٹے لیٹے پڑھ لو]

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: جب یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حصول چلنے کے بغیر بھی بہت سے طرق سے حاصل ہوسکتا ہے تو پھر اس حدیث کی مراد اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس کے عمل کی جزاء دیتا ہے، چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور اس کے قرب کی طلب میں سچا ہو، خواہ وہ سست رفتار ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کے عمل سے کہیں اکمل وافضل جزاء عطا فرمائے گا۔

لہذا مذکورہ شرعی قرینہ جواس حدیث کے سیاق سے مفہوم ہورہا ہے کی روشنی میں یہی معنی، معنیٰ ظاہر قرار پائے گا۔اس معنی پر اہل السنۃ کوخروج عن الظاہر کا الزام دینا درست نہیں (کیونکہ یہ معنی سیاقِ حدیث سے شرعی قرینہ کے پیشِ نظر کیا گیا ہے) نہ ہی اس معنی کو معطلہ کے انداز کی تاویل قرار دیکر اہل السنۃ کے خلاف کوئی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔(وللہ الحمد)

اس قول کا جو بھی قائل ہے وہ اس وجیہ اور قابلِ غور اجتہاد واستدلال پر مستحق اجر ہے۔مگر ہم پہلے قول کو زیادہ واضح ،پُر عافیت اور مذہبِ سلف کے زیادہ لائق اور قریب ترین قرار دیتے ہیں۔

(جس کا ملخص یہ ہے کہ اس قسم کے امور اللہ تعالیٰ کے افعالِ اختیاریہ کے ضمن میں ہیں،جنہیں اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور اس طرح انجام دیتا ہے کہ اس کا علو واستواء علی العرش بھی ثابت و برقرار رہتا ہے،اوران افعالِ اختیاریہ کی نہ تو ہم کیفیت جانتے ہیں نہ ان کے بارہ میں تشبہ بالمخلوقات کا عقیدہ رکھتے ہیں)

واضح ہو کہ مذکورہ قول کے قائل نے جس قرینہ سے مذکورہ استدلال کیا ہے،اس کا جواب ممکن ہے،اس قائل نے اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ صرف ''مشـی''یعنی چلنے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے،اور بھی بہت سے طرق ہیں،کما تقدم۔(لہذا جس طرح بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف چل کر جانا حقیقی معنی پر محمول نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف دوڑ کر آنا محمول بر حقیقت نہیں ہوگا)اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ حدیث میں چلنے کا ذکر علی سبیل المثال ہے،نہ کہ علی سبیل الحصر۔لہذا حدیث میں اگر''مشی''یعنی چلنے کا ذکر ہے تو اس سے مقصود ان عبادات کی مثال دینی ہیں جو''مشـی'' سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے مساجد کی طرف چل کر جانا اور جیسے بیت اللہ کا طواف اور صفا،مروہ کی سعی وغیرہ۔واللہ اعلم

تیرہویں مثال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَالَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا﴾(یٰس:۷۱)

ترجمہ: (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کیلئے چوپائے جانور بھی پیدا کردیئے)

جواب: پہلے اس آیت کے ظاہری وحقیقی معنی کا تعین ضروری ہے، تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ یہاں معنیٰ ظاہر سے انحراف کی کیا شکل ہے؟

کیا اس آیت کا ظاہری وحقیقی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، جیسا کہ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے خلق فرمایا؟ یا اس آیت کا ظاہری معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو اس طرح پیدا فرمایا جس طرح دیگر مخلوقات کو پیدا فرمایا (یعنی اپنے ہاتھ سے نہیں) بلکہ تخلیقِ انعام کی نسبت اپنے ہاتھ کی طرف فرمائی ہے، مراد اپنی ذات ہے (یعنی صاحب الید) جس عربی لغت میں قرآن مجید کا نزول ہوا اس میں یہ اسلوب معروف ہے۔

پہلا قول آیتِ مذکورہ کا ظاہر نہیں بن سکتا اور اس کی دو وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ کہ جس عربی لغت میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا اس میں آیتِ کریمہ میں استعمال شدہ لفظ کا ظاہری تقاضہ یہ نہیں بنتا، اس سلسلہ میں مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا اَصَابَکُم مِنْ مُّصِیبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ﴾ (الشوریٰ ۳۰)

ترجمہ: (تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے)

نیز فرمایا: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ (الروم: ۴۱)

ترجمہ: (خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کے باعث فساد پھیل گیا، اس لیئے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے بہت ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں)

نیز فرمایا: ﴿ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ﴾ (آل عمران: ۱۸۲)

ترجمہ: (یہ تمہارے ہاتھوں کے بھیجے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہے)

ان آیات میں اگر چہ کمانے اور بڑھانے کی نسبت ہاتھوں کی طرف ہے، مگر مراد انسان کی ذات ہے، لہٰذا ہاتھوں کے بغیر بھی اگر کسی معصیت کا ارتکاب کرے گا تو وہ پکڑ کا باعث بنے گی...... البتہ کلامِ عرب کی روشنی میں اگر کوئی شخص یوں کہے: ''عملتہ بیدی''، یعنی فلاں کام میں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے، تو اس سے مراد ہاتھ کا عمل ہی ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

ترجمہ: (ان لوگوں کیلئے ''ویل'' ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف کی کہتے ہیں) (البقرۃ:۷۹)

یہاں براہِ راست ہاتھ سے کیا جانے والا عمل مراد ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آیتِ مذکورہ کا معنیٰ مراد یہی ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے تو آیتِ کریمہ یوں ہوتی: ''خَلَقْنَا لَهُمْ بِاَيْدِيْنَا اَنْعَامًا'' (یعنی ہم نے ان کیلئے اپنے ہاتھوں سے چوپایوں کو پیدا فرمایا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خلقِ آدم علیہ السلام کے حوالے سے ارشاد فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص:۷۵) (تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا)

کیونکہ قرآنِ حکیم بیان وتوضیح کیلئے ہے نا کہ تعمیہ (اندھیرے میں رکھنے) کیلئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل:۸۹)

ترجمہ: (اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے، جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے)

جب قولِ اول کا بطلان واضح ہوگیا تو قولِ ثانی کا صحیح ہونا طے پا گیا۔ جس کا ملخص یہ ہے کہ یہاں ظاہرِ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کو بھی دیگر تمام مخلوقات کی طرح پیدا فرمایا ہے، یعنی چوپایوں کو (آدم علیہ السلام کی طرح) اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا۔ لیکن خلقِ انعام کی اپنے ہاتھ کی طرف نسبت فرمائی، جس سے مراد اپنی ذات ہے۔ لغتِ عربیہ کا یہی مقتضیٰ ہے۔

البتہ جب کسی فعل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے حرفِ "باء" کے ذریعے "ید" یعنی ہاتھ کی طرف متعدی کر دیا جائے، تو اس سے مراد اس عمل کا ہاتھ کے ذریعے ہی انجام دینا ہے...... دونوں جملوں کے استعمال میں فرق کو بخوبی سمجھ لیجئے، کیونکہ متشابہات میں فرق کیلئے ان اسالیب وتراکیب کا فہم، علم کی انتہائی عمدہ قسم ہے، اس فہم سے بہت سے اشکال خود بخود درفع ہو جاتے ہیں۔

چودھویں مثال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ (الفتح:۱۰)

ترجمہ: (جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے)

جواب: اس آیت کے ضمن میں دو جملے قابلِ غور ہیں:

(۱) پہلا جملہ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ﴾ ہے۔ سلفِ صالحین اہل السنۃ نے اس آیتِ کریمہ کا ظاہری وحقیقی معنی مراد لیا ہے، جو یہ ہے کہ صحابہ کرام نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح:۱۸) ترجمہ: (یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے خوش ہو گیا جب کہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے)

آیتِ کریمہ: ﴿اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ﴾ سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ صحابہ کرام نے ذاتِ باری تعالیٰ سے بیعت کی، نہ ہی اس معنی کے متعلق آیتِ کریمہ کے ظاہری معنی ہونے کا دعویٰ کیا جائے، کیونکہ یہ معنیٰ آیتِ کریمہ کے ابتدائی حصہ کے خلاف ہے، نیز پیش کردہ دوسری آیت کے بھی خلاف ہے، نیز امرِ واقع کے بھی خلاف ہے، (امرِ واقع یہ ہے کہ تمام صحابہ نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی) نیز یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں ناممکن ومحال ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کو اپنی بیعت اس لیئے قرار دیا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول، نمائندے اور

ایلچی ہیں، اور یہ بات معلوم ہے کہ صحابہ کرام نے یہ بیعت، جہادِ فی سبیل اللہ کے اہم نکتہ پر کی تھی، لہذا رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اس ذات کی راہ میں کہ جس نے آپ ﷺ کو بھیجا، جہاد کی بیعت، اس بھیجنے والی ذات کی بیعت ہی قرار پائے گی، کیونکہ آپ ﷺ اس ذات کے رسول ہیں، اور اس کے دین کو پہنچانے والے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اس ذات کی اطاعت ہے، جس نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾

یعنی جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی)

صحابہ کرام کی اس بیعت کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت واضافت میں کئی ارفع واعلیٰ حکمتیں پنہاں ہیں، جن میں:

☆ رسول اللہ ﷺ کے شرف وعظمت کا اظہار۔

☆ آپ ﷺ کی نصرت وتائید کا اعلان۔

☆ اس بیعت کی عظمت وجلالتِ شان کا بیان۔

☆ اور بیعت کرنے والوں کی رفعتِ شان کا اقرار واثبات، قابل ذکر ہیں۔

ان تمام حوالوں سے اس بیعت کا معاملہ بالکل ظاہر وواضح ہے، اور کسی ذی عقل سے مخفی نہیں ہے

دوسرا جملہ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾

ترجمہ: (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا)

یہ جملہ بھی ظاہری وحقیقی معنی پر محمول ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے اوپر تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے، لہذا اس کا ہاتھ سب سے اوپر ہے۔ یہی اس آیتِ کریمہ کا ظاہر وحقیقت ہے۔ اور یہ جملہ بطورِ تاکید ہے، یعنی نبی ﷺ کی بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بیعت ہے...... اس

سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کو چھورہا تھا۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''السماء فوقنا ''یعنی آسمان ہمارے اوپر ہے۔تو اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ ہمارے سروں سے مس ہورہا ہے، بلکہ وہ تو ہم سے جدا اور ہم سے کہیں دور ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں کے اوپر ہونا اسی عقیدہ کے ساتھ منسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق سے جدا، سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔

واضح ہو کہ یہاں کسی شخص کیلئے قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ کے تحت یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے مراد نبی ﷺ کا ہاتھ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہاتھ کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے، اور پھر اپنے ہاتھ کے بارہ میں فرمایا: کہ وہ ان کے ہاتھوں کے اوپر تھا۔ جب کہ نبی ﷺ کا ہاتھ بیعت کے وقت صحابہ کے ہاتھوں کے اوپر نہیں ہوتا تھا، بلکہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیتے اور مصافحہ کے انداز سے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیتے، تو آپ ﷺ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے ساتھ ہوتا نہ کہ اوپر۔

پندرہویں مثال: ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[یاابن آدم مرضت فلم تعدنی](الحدیث)

واضح ہو کہ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے، اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نقل فرمایا ہے، (کتاب البر والصلة والآداب (رقم ۴۳ ص ۱۹۹) مکمل حدیث ملاحظہ ہو:

[عن ابی هريرة رضی الله عنه قال :قال رسول الله ﷺ :ان اللهتعالىٰ يقول يوم القيامة :ياابن آدم مرضت فلم تعدنی قال:يارب كيف اعودک وانت رب العالمين قال:اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده اما علمت انک لوعدته لوجدتنی عنده ياابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال:يارب وكيف

اطعمک وانت رب العالمين قال:اما علمت انه استطعمک عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت لو أطعمته لوجدت ذلک عندی یاابن آدم استسقيتک فلم تسقنی قال :يارب كيف اسقيک وانت رب العالمين قال:استسقاک عبدی فلان فلم تسقه اما انک لو سقيته وجدت ذلک عندی]

ترجمہ:[ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ کہے گا: میں تیری کیسے عیادت کرتا تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہیں معلوم نہ تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، مگر تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا؟ بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نہیں جانتا؟ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے اسے نہیں کھلایا، تجھے معلوم نہیں اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو اس کا صلہ میرے ہاں پالیتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ بندہ کہے گا: اے اللہ میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو تو رب العالمین ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے اسے پانی نہیں پلایا، اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اس کا صلہ میرے پاس پالیتا۔]

جواب: سلفِ صالحین نے اس حدیث کے ظاہر ہی کو لیا ہے، اور بھلا وہ ظاہر سے عدول کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں، اور وہ بھی ان لوگوں کی طرح جو نصوص میں تحریف جیسے فعلِ شنیع کا ارتکاب کر کے اپنی من مانی خواہشات کے ذریعے خطیاں مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سلفِ صالحین نے اس حدیث کی وہ تفسیر کی ہے جو اس کے متکلم (اللہ تعالیٰ) نے کی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: میں بیمار ہوا...... میں نے تجھ سے کھانا مانگا...... میں نے تجھ سے پانی مانگا...... وہ جملے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے خود ہی تفسیر کردی۔ چنانچہ بندے کے استفسار پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ بیمار ہوگیا تھا...... میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا...... میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا...... اللہ تعالیٰ کی یہ تفسیر اس بات کی صریح دلیل ہے کہ بیمار ہونے والا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ تھا۔ اسی طرح کھانا اور پانی طلب کرنے والا اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ تھا۔ اب یہ تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی جو اس حدیث کا متکلم ہے اور جو اسکی مراد کو سب سے زیادہ اور بہتر جاننے والا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اس مرض کی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، یا وہ کھانا طلب کرنا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے یا وہ پانی مانگنا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، کی تفسیر بندے کے مرض سے کریں، یا اس کے کھانا یا پانی طلب کرنے سے کریں تو یہ تو کوئی تاویل ہے نہ تحریف ہے، اور نہ ہی معنیٔ ظاہر سے عدول وانحراف، کیونکہ یہ تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے...... اب اسے یوں ہی سمجھیئے جیسے اللہ تعالیٰ ان امور کو اپنی طرف منسوب کیئے بغیر ابتداءً اپنے بندوں کی طرف منسوب فرمارہا ہے۔

اب سوال یہ باقی رہ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو اپنی ذات کی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فقط ترغیب وتحریض کا معنی اجاگر کرنے کیلئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (البقرۃ:۲۴۵)

ترجمہ: (ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دے)

(اب بھلا اللہ تعالیٰ کو قرض کی کیا حاجت؟ بس اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب کے ذریعے صدقہ کی اہمیت اور اس پر ترغیب وتحریض کا پہلو اجاگر فرمایا۔)

یہ حدیث سب سے بڑی اور قوی دلیل ہے، جو ان اہل تاویل کہ جو کتاب وسنت کی دلیل کے

بغیر ہی نصوصِ صفاتِ باری تعالیٰ کو ان کے ظاہر سے بصورتِ تحریف پھیرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں، کے سروں پر ضرب کاری ہے۔ ان کی تمام تر تحریفات اور تاویلات کی بنیاد ان کے وہ شبہات ہیں جن میں وہ خود ہی متناقض، مضطرب اور متحیر ہیں۔ کیونکہ ان نصوص کی مراد اگر معنیٰ ظاہر کے خلاف ہوتی تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ضرور بالضرور اسے بیان فرما دیتے، اور اگر ان نصوص کا ظاہر اللہ تعالیٰ پر ممتنع ہوتا تو بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس کا ضرور بیان فرما دیتے، جیسا کہ اس حدیث میں فرما دیا، اور اگر ظاہرِ نصوص جو (سلفِ صالحین کے بیان کے مطابق) اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، (بقول اہلِ تاویل) اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہوتا تو کتاب وسنت میں ایسی بے شمار مثالیں ہوتیں جو اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر مشتمل ہوتیں، جو اللہ تعالیٰ پر (بقول اہلِ تاویل) ممتنع ہوتیں، اور ان کا اثبات بڑے تکلف کے ساتھ کرنا پڑتا...... یہ سب سے بڑا محال ہے۔

ہم اسی قدر مثالوں کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں، تاکہ ہماری یہ ذکر کردہ مثالیں دوسری مثالوں کے لیئے مشعلِ راہ بن جائیں، ورنہ نصوصِ صفات کے تعلق سے اہل السنۃ کا قاعدہ معروف ہے، اور وہ یہ کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق تمام آیات واحادیث کو ان کے معنیٰ ظاہر پر برقرار رکھو اور ان میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف یا تمثیل وتشبیہ کا ارتکاب نہ کرو۔

گزشتہ اوراق میں قواعدِ صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

(والحمد للہ رب العالمین)

خاتمہ

اگر کوئی شخص کہے : ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں اہلِ تاویل کا مذہب باطل ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ سب سے زیادہ صفات میں تاویلیں گروہِ اشاعرہ کی ہیں، تو پھران کا مذہب کیونکر باطل ہوسکتا ہے، جبکہ یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں ان کی تعداد ۹۵٪ ہے، نیز یہ کہ اس باب میں ان کا امام ومقتدیٰ ابوالحسن الاشعری جیسی شخصیت ہے، تو پھران کا مذہب کیسے باطل ہوسکتا ہے؟ پھران میں فلاں اور فلاں بڑے بڑے علماء ہیں جن کی اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، قرآن وحدیث اور حکام ورعیت کیلئے خیر خواہی کے جذبات معروف ومسلّم ہیں، تو پھران کا مذہب کیسے باطل ہوسکتا ہے؟

جواب: پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ دنیا کے تمام فرقوں اور جماعتوں میں اشاعرہ کی تعداد ۹۵٪ ہے، یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا اثبات انتہائی دقیق اعداد وشمار کا طالب ومتقاضی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ وہ اتنی یا اس سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں، تو یہ تعداد ان کے معصوم عن الخطاء ہونے کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ عصمت مسلمانوں کے اجماع میں ہے نہ کہ کثرتِ تعداد میں۔

اب ہم غور کرتے ہیں کہ دورِقدیم کے مسلمانوں کا اجماع کس چیز پر قائم ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ دورِقدیم کے مسلمانوں کا اجماع اہلِ تاویل کے مذہب کے خلاف قائم ہے۔

چنانچہ اس امت کے سلفِ صالحین کا پہلا گروہ صحابہ کرام کا تھا، جن کے دور کو خیر القرون کہا گیا تھا، پھران کے بعد تابعین اور بعد میں آنے والے تمام اَئمہ ہدایت اس بات پر مجمع اور متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کیلئے جو اسماء وصفات بیان فرمادیئے ان کا اثبات اور اقرار واعتراف کیا جائے، ان تمام کو ان کے معنیٰ ظاہر پر محمول کیا جائے، وہ معنیٰ ظاہر جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، جس میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف یا تمثیل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ یہ

ان لوگوں کا اجماع ہے جن کا خیر القرون ہونا نبی ﷺ کے بیان سے منصوص ہے، جن کے اجماع کو لازمی حجت قرار دیا گیا ہے، بلکہ ان کے اجماع کا حجت ہونا کتاب وسنت کا مطلوب ومقتضی ہے۔ نصوصِ صفات کے قواعد کی بحث کے قاعدہ نمبر۴ میں اس اجماع کی نقل پیش کی جا چکی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ امام ابوالحسن الاشعری اور دیگر ائمہ مسلمین میں سے کوئی بھی اپنی ذات کے بارہ میں معصوم عن الخطأ ہونے کا دعویدار نہیں ہے، انہیں امامتِ دین کا شرف ومرتبہ تب ہی حاصل ہوا جب انہوں نے اپنے نفوس کی قدر پہچانی اور انہیں جائز وصحیح مقام پر (بلا افراط وتفریط) قائم وفائز رکھا۔

ان کے دلوں میں کتاب وسنت کی صحیح تعظیم تھی جس کی بناء پر وہ شرفِ امامت کے مستحق بن گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة:۲۴)

ترجمہ: (اور ہم نے ان میں سے، چونکہ ان لوگوں نے صبر کیا تھا ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے)

اللہ تعالیٰ نے ابراھیم علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ . شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اِجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (النحل:۱۲۰،۱۲۱)

ترجمہ: (بیشک ابراھیم پیشوا اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور یک طرفہ مخلص تھے، وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا برگزیدہ کر لیا تھا اور انہیں راہِ راست سجھادی تھی)

واضح ہو کہ متأخرین اشاعرہ جو امام ابوالحسن الاشعری کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں وہ ان کی صحیح معنی میں اقتداء کا حق ادا نہ کر سکے، چنانچہ عقیدہ کے باب میں، ابوالحسن الاشعری

کی زندگی تین مراحل میں تقسیم ہوتی ہے:

(۱) پہلا مرحلہ: مرحلہَ اعتزال ہے، انہوں نے چالیس سال معتزلہ کا مذہب اپنائے رکھا، اسے بڑی شد ومد سے پیش کرتے، اور اس کے اثبات کیلئے مناظرے کرتے، پھر مذہبِ معتزلہ سے رجوع کرلیا، اور بڑی صراحت سے ان کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا، اور اسی شد ومد سے ان کی تردید وتفنید شروع کردی۔

(۲) دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ خالص اعتزال اور خالص سنت کے بیچ بیچ ایک راہ اپنالی، یہ ابومحمد عبداللہ بن سعید بن کلاب کا منہج تھا، جس کے وہ پیروکار بن گئے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۱۶/۴۷۱) میں فرماتے ہیں:

'' ابوالحسن الاشعری اور اس جیسے دیگر لوگ سلفِ صالحین اور جہمیہ کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے کچھ باتیں سلفِ صالحین سے لے لیں، جو صحیح تھیں، اور کچھ عقلی اصول جہمیہ سے لے لئے، جنہیں وہ صحیح سمجھتے رہے، حالانکہ وہ سب باطل اور فاسد تھے۔

(۳) تیسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ وہ باطل منہج سے رجوع کرکے، امام اہل السنۃ امام احمد بن حنبل کے منہج کو سینے سے لگالیتے ہیں، جو تمام اہل السنۃ اہل الحدیث کا مذہب تھا، چنانچہ وہ خود اپنی کتاب ''الابانۃ عن اصول الدیانۃ '' جوان کی آخری کتب میں شمار ہوتی ہے کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

'' نبی ﷺ ہمارے پاس کتابِ عزیز لے کر آئے، ایسی کتاب کہ باطل کو نہ اس کے آگے سے، نہ اس کے پیچھے سے حملہ کرنے کی جرأت ہے، وہ اللہ تعالیٰ، حکمت والے، سزوارِ حمد وثناء کی کتاب ہے، اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے اولین کے تمام علوم کو جمع فرمادیا ہے، اور دین اور اسکے فرائض کی تکمیل فرمادی، یہی اللہ تعالیٰ کا صراطِ مستقیم ہے اور یہی اس کی مضبوط رسی ہے، جس نے اسے مضبوطی سے تھاما، نجات پاگیا، اور جس نے اس کی مخالفت مول لی گمراہ وبرباد ہوگیا، وہ ہمیشہ

جہل کی اتھاہ گہرائیوں اور تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں اپنے رسول ﷺ کی سنت پر تمسک واعتصام کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (حشر:۷)

ترجمہ: (اور تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ)

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جس طرح اپنی اطاعت پر مامور فرمایا اور اپنی کتاب پر عمل کا حکم دیا اسی طرح اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم دیا، اور آپ کی سنت کے ساتھ تمسک کی دعوت دی، لیکن جن لوگوں پر شقاوت وہلاکت غالب آ گئی، اور جنہیں شیطان نے پوری طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیا انہوں نے نبی ﷺ کی سنتوں کو پس پشت ڈال دیا، انہوں نے رسول اللہ کی سنتوں کو نہ صرف عملی طور پر ٹھکرایا بلکہ انکار اور جحود وعناد کی روش اپنالی، اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھ کر، اپنے جیسے معاندین وملحدین کے پیروکار بلکہ مقلد بن کر پورے پورے گمراہ ہوگئے، اور ہدایت سے کوسوں دور چلے گئے۔''

اس کے بعد امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ نے اہلِ بدعت کے کچھ اصول ذکر فرمائے اور ان کے باطل ہونے کا عندیہ دیا، پھر فرمایا:

''اگر کوئی شخص کہے کہ تم نے معتزلہ، جہمیہ، خوارج، روافض اور مرجہ سب کے مذہب کا انکار کر دیا، تو اب اپنا مذہب تو پیش کیجئے اور جس دین کو آپ اپناتے ہیں اس کی وضاحت کیجئے، ہم جواب دیں گے: ہمارا عقیدہ ومذہب کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اور صحابہ، تابعین وائمہ اھل الحدیث نے جو کچھ روایت کیا ہے، کے ساتھ تمسک کا ہے، ہم انہیں مضبوطی کے ساتھ تھامنے والے ہیں اور امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل، اللہ تعالیٰ ان کے چہرے کو تر وتازہ فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور انکو اجرِ عظیم سے نواز دے، کے منہج کے قائل ہیں، اور جو شخص امام احمد بن حنبل کے عقیدہ ومنہج کے مخالف ہے، اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے والے ہیں؛ کیونکہ امام احمد

بن حنبل رحمہ اللہ امامِ فاضل اور رئیسِ کامل ہیں۔"

اس کے بعد ابوالحسن الاشعری نے امام احمد بن حنبل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو تائیدِ حق فرمائی اس کی بہت تعریف کی، پھر صفاتِ باری تعالیٰ، مسائل قدر، شفاعت اور بعض دیگر شبھات کا نقلی وعقلی دلائل سے اثبات پیش کیا۔

افسوس کہ متاخرینِ اشاعرہ نے جو ان کی طرف منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں ان کی زندگی کے تین مذکورہ مراحل میں سے دوسرے مرحلہ کو تھام لیا، اور بیشتر صفات میں تاویل کی روش اپنالی، صرف سات صفات کو بلا تاویل مانا (باقی سب میں تاویل کی راہ پر چل نکلے) وہ صفات مندرجہ ذیل شعر میں مذکور ہیں:

حی علیم قدیر والکلام له　　　　إرادة وکذلک السمع والبصر

(یعنی صفتِ حیات، علم، قدرت، کلام، ارادہ، سمع اور بصر)

ان صفات کے اثبات کی کیفیت میں بھی ان کے اور اھل السنۃ کے منہج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔"

شیخ السلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۳۵۹/۶) میں اشاعرہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اشعریہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خبریہ کی نفی کرتے ہیں، البتہ اشاعرہ میں سے وہ لوگ جو "کتاب الدیانۃ" جو کہ ابوالحسن الأشعری کی آخری عمر کی تالیف ہے اور جس کے مخالف یا مناقض ان کا کوئی مقالہ منظرِ عام پر نہیں آیا، کی بات کرتے ہیں، ان کا یقینی طور پر اُھل السنۃ میں شمار ہوگا۔"

اس سے قبل شیخ الاسلام نے (ص:۳۱۰) میں فرمایا تھا:

"اُشعریہ (جن کا عقیدہ اھل السنۃ کے برعکس ہے) کا صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں مذہب

تعطیل کو مستلزم ہے، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ عالَم کے اندر ہے نہ باہر۔''

(وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ کے پورے کلام کا ایک ہی معنی ہے جس کی رو سے آیت الکرسی اور آیۃ الدَین (قرضہ کے احکام والی آیت) اور توراۃ وانجیل سب کا ایک معنی ہے......اس عقیدے کا فاسد ہونا بداھۃً وظاہراً معلوم ہے۔

شیخ الاسلام کے شاگرد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ قصیدۂ نونیہ (ص:۳۱۲) میں فرماتے ہیں:

واعلم بأن طريقهم عكس الطريق المستقيم لمن له عينان

جان لو کہ اشاعرہ کا منہج أھل السنۃ کے منہجِ مستقیم کے بالکل برعکس ہے، کھلی آنکھوں سے دیکھنے والا اس حقیقت کو بخوبی سمجھتا ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

فاعجب لعميان البصائر أبصروا كون المقلد صاحب البرهان

ورأوه بالتقليد أولى من سواه بغير مابصرولابرهان

وعموا عن الوحيين إذ لم يفهموا معناهما عجبا لذى الحرمان

ترجمہ: بصیرت کے اندھوں پر تعجب ہے کہ وہ مقلد کو صاحبِ دلیل قرار دیتے ہیں، اور وہ بلا غور وفکر اور بلا دلیل، مقلد کو بوجہ تقلید دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ دونوں وحیوں (قرآن وحدیث) سے بالکل اندھے ہیں؛ کیونکہ وہ ان کا معنی سمجھنے سے قاصر ہیں، تو اس محرومِ ہدایت شخص پر تعجب ہے۔

الشیخ محمد أمین الشنقیطی اضواء البیان (۳۱۹/۲) میں سورۂ الاعراف کی آیت مبارکہ جس میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جان لو کہ اس معاملہ میں متأخرین میں سے بے شمار لوگ بہت بڑی غلطی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً: استواء علی العرش یا الید (ہاتھ) وغیرہ کا جو معنیٰ ظاہر، متبادر

الی الذہن ہے، اس کو مان لینے سے مخلوقات سے تشبیہ لازم آتی ہے، لہذا ان نصوص کو ان کے معنئ ظاہر سے اجماعاً پھیرنا فرض ہوا۔

(شیخ فرماتے ہیں:) اب آپ غور کریں کہ ان کے اس قول سے کیا لازم آرہا ہے؟ اس قول سے لازم آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس کے اندر جو اپنی صفات بیان فرمائی ہیں ان کا ظاہری معنی کفر پر مشتمل ہے، ان کے معنئ متبادر الی الفہم کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ صفات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارہ میں خود بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے پیغمبر ﷺ کا منصب یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

ترجمہ: (یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل کیا گیا ہے، آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں)

چنانچہ نبی ﷺ نے نصوصِ صفات کے بارہ میں کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کا معنئ ظاہر، ومتبادر الی الذہن، کفر وضلال پر مشتمل ہے، بلکہ اس سلسلہ میں نبی ﷺ سے ایک حرف بھی منقول نہیں ہے، اور یہ بات ناممکن ہے کہ آپ ﷺ بوقتِ ضرورت خاموش رہیں اور وہ بھی عقیدہ کے بارہ میں؟؟

افسوس کہ متأخرین میں سے یہ جاہل لوگ رونما ہوئے جو گویا زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی صفات بیان فرمائی ہیں ان کا ظاہری معنی، اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں، اور یہ نکتہ (نعوذ باللہ) نبی ﷺ نے بھی اپنی امت سے چھپایا، لہذا ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم تاویلوں کے ذریعے ان نصوص کے معنئ ظاہر کو پھیر دیں۔ یہ ساری باتیں کتاب وسنت سے بالکل منحرف ہوکر ان کی ذاتی خواہشات ومیلانات پر مبنی ہیں۔

اے اللہ تو پاک ہے، یہ بہتانِ عظیم ہے، ان کی یہ باتیں سب سے بڑی گمراہی، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر سب سے بڑا افتراء ہے۔

قارئین کرام! حق بات، جس میں تھوڑی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی ذرہ برابر شک نہیں کر سکتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی، وہ اپنے معنیٰ ظاہر، متبادر الی الذہن سے ثابت ہے، اور جس شخص کے دل میں ایمان کی رمق بھی پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے بارہ میں مخلوقات سے مشابہت کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تشبہ بالمخلوقات سے کلی طور پر منزہ سمجھے گا۔

(شیخ شنقیطی مزید فرماتے ہیں) بھلا ایک عاقل اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے حوالے سے جو کچھ شریعت میں وارد ہوا ہے اس کا معنیٰ متبادر الی الذہن یا معنیٰ سابق فی الذہن، خالق اور مخلوق کے مابین پوری منافات پر قائم ہے (نہ کہ تشبیہ پر) اس حقیقت کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل کبر وعناد سے لبریز ہو۔

ایک جاہل ومفتری انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی آیات کا جو معنیٰ ظاہر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں؛ کیونکہ وہ کفر وتشبیہ پر منتج ہوتا ہے، اب تشبیہ کی اس گندگی نے (جو اس کی اپنی پیدا کردہ ہے) اس کے دل کو نجس وناپاک کر دیا، اور پھر تشبیہ کی نحوست نے اسے صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی وانکار پر مجبور کر دیا حالانکہ ان صفات کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیئے بیان فرمایا ہے

اب یہ جاہل انسان پہلے مشبہ بنا، اور پھر معطل (صفات کا انکار کرنے والا) بن گیا، اور نتیجۃً وہ خود اس عقیدے کا مرتکب ہو گیا جو اول تا آخر کسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لائق نہیں ہے۔ اور اگر اس کا دل کما حقہ اللہ تعالیٰ کی معرفت پر قائم ہوتا، اور کما حقہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا حامل ہوتا، اور اسکے ساتھ ساتھ تشبیہ کی گندگیوں اور غلاظتوں سے پاک ہوتا تو قرآن وحدیث میں اللہ رب العزت کی بیان کردہ صفات کو پڑھ کر اس کے دل ودماغ میں یہی پاکیزہ تصور پیدا ہوتا کہ یہ صفاتِ باری تعالیٰ جو کمال وجلال کا انتہائی عظیم الشان مظہر ہیں، مشابہت مع المخلوقات کے تمام اوہام وعلائق سے پاک ومنزہ ہیں۔ نتیجۃً اس کا دل ان صفاتِ کمال وجلال پر بلا تشبیہ وتاویل ایمان

لانے پر مستعد ہوتا، ایسا ایمان جو اللہ رب العزت کے شایانِ شان ہے، جس کی اساس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: (اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے اور دیکھنے والا ہے)

(شیخ شنقیطی رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا)

واضح ہوا کہ امام ابوالحسن الأشعری رحمہ اللہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں اہل السنۃ، اھل الحدیث کا مذہب اختیار کر چکے تھے، جس کا ملخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو جو صفات خود یا اپنے نبی ﷺ کی زبان سے بیان فرمائیں وہ تمام کی تمام اللہ رب العزت کیلئے بلاتحریف، بلاتعطیل، بلاتکییف، اور بلاتمثیل ثابت ہیں۔ اور انسان کا وہی مذہب معتبر ہے جس کا وہ سب سے آخر میں بالحصر اقرار واثبات کرے، چنانچہ ابوالحسن الأشعری کی کتاب "الابانۃ" جو ان کی زندگی کی آخری کتاب شمار ہوتی ہے، میں اسی عقیدہ کی صراحت موجود ہے۔

لہذا اب اگر کوئی شخص ان کی تقلید کا مدعی یا طالب ہے تو اس پر واضح ہونا چاہیئے کہ انکی تقلید کی تکمیل انکے اس مذہب کی اتباع پر قائم ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی میں سب سے آخر میں اپنایا اور بصراحت لکھا، اور وہ مذہب، مذہبِ اھل الحدیث ہے، یہی مذہب صحیح اور واجب الاتباع ہے اور اسی مذہب کو امام ابوالحسن الأشعری نے بالالتزام اختیار کرلیا۔ (فرحمه الله رحمة واسعة)

اب تیسرے سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔ (سوال یہ تھا کہ اشاعرہ کیسے باطل ہوسکتے ہیں، حالانکہ ان میں بڑے بڑے علماء اور معروف دعاۃ موجود ہیں؟) اس کا جواب دو وجوہ سے ہے۔

ایک یہ کہ حق کو شخصیات کے ساتھ نہیں تولا اور پرکھا جاتا، بلکہ شخصیات کو حق کے میزان میں تولا جاتا ہے۔ معرفتِ حق کی یہی صحیح میزان ہے۔ یہ بات درست ہے کہ شخصیتوں کے مقام ومرتبہ کا ان کے اقوال کے قبول کرنے میں ایک اثر ہے، جیسا کہ عادل راوی کی خبر کے قابلِ قبول ہونے

اور فاسق کی خبر کے قابلِ توقف (یا قابلِ رد) ہونے کا قاعدہ موجود ہے،لیکن ہر حال میں اس کو معرفتِ حق کا میزان قرار دینا درست نہیں ہے۔ ہر انسان ایک بشر ہے اور کوئی بشر علمِ کامل اور فہمِ کامل کا دعوئ نہیں کرسکتا، اس کے فہم وعلم میں اگر بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہوگی۔ایک شخص بعض اوقات دین دار اور صاحبِ خلق ہوتا ہے،لیکن ساتھ ساتھ ناقص العلم اور ضعیف الفہم بھی ہوتا ہے،لہذا اس ضعف اور نقص کے بقدر وہ علمِ صحیح سے خالی یا محروم ہوجاتا ہے۔یا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نشوونما ایک معین مذہب پر ہوتی ہے، وہ دوسرے مذاہب کو جان ہی نہیں پاتا، نتیجۃً یہی سمجھ بیٹھتا ہے کہ حق وثواب اس کے مذہب میں منحصر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ہم ان علماء ورجال کا جو اشاعرہ کے مذہب پر قائم تھے، ان علماء ورجال کے ساتھ مقارنہ ومقابلہ کریں جو اہل السنۃ سلف صالحین کے مذہب پر تھے،تو ہم پر یہ بات واضح اور آشکارا ہوگی کہ مذہبِ سلف صالحین کے علماء، مذہبِ اشاعرہ کے علماء سے مقام میں کہیں بڑے، علم میں کہیں برتر، اور ہدایت وطریقِ مستقیم کو اپنانے میں کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم تھے۔

چنانچہ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) جن کی ایک خلقِ عظیم پیروکار ہے، عقیدہ کے باب میں اشاعرہ کے مذہب پر نہیں بلکہ سلف صالحین اہل الحدیث کے مذہب پر تھے۔اس سے بھی اوپر اگر آپ طبقۂ تابعین پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو ان میں سے کوئی بھی مذہبِ اشاعرہ پر نہیں ملے گا۔اور اگر اس سے بھی اوپر اصحابِ رسول ﷺ اور خلفاءِ راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زریں اور سنہری دور کو دیکھیں تو اسماء وصفات کے باب میں، ان میں سے کسی کا وہ عقیدہ نہیں جسے اشاعرہ اپنا کر مذہبِ سلف صالحین سے خارج ہوگئے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اشعری مذہب کی طرف منسوب بعض علماء کی اسلام میں اچھی خدمات ہیں، انہوں نے اسلام کا بھرپور دفاع کیا، نیز انہوں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا روایۃً ودرایۃً اہتمام بھی کیا، وہ مسلمانوں کے نفع وہدایت کے حریص بھی تھے،لیکن یہ

تمام امور قطعاً اس بات کو موجب و مستلزم نہیں کہ جس مسئلے یا مسائل میں وہ غلطی کر گئے، غلطی کے باوجود انہیں معصوم قرار دے دیا جائے؟ اور ان کے ہر قول کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے؟ اور ان کی غلطیوں کو بیان کر کے ان کا رد نہ کیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اخطاء واغلاط کے ذکر اور پھر رد میں بیانِ حق اور ہدایت و نصیحتِ خلق کا پہلو موجود ہے۔ جو نہایت ضروری ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ بعض اشعری علماء کی (اختیارِ مذہب کے تعلق سے) نیت انتہائی نیک اور صالح تھی، لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی کا قول قبول کرنے کیلئے محض اس کی نیت کا اچھا ہونا کافی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ قول اللہ تعالیٰ کی شریعت کے بھی موافق ہو۔ اگر موافق نہ ہو بلکہ مخالف ہو تو اس کا رد کرنا ضروری ہے، خواہ اس کا قائل کوئی بھی ہو۔ الصادق المصدوق محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: [من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد]

[جس شخص نے (خواہ وہ کوئی بھی ہو) کوئی ایسا عمل کیا جسے ہماری تائید و موافقت حاصل نہیں تو وہ مردود ہے]

پھر حسنِ ادب کا تقاضہ یہ ہے کوئی ایسا شخص جو خیر خواہانہ جذبات اور طلبِ حق میں صدق اور اخلاص کے ساتھ معروف ہو، اگر غلطی کر جائے تو اس کے خلاف فتویٰ یا بدکلامی کا محاذ کھولنے کے بجائے اسے معذور قرار دیا جائے (کہ غلطی تو ہر انسان سے ہو سکتی ہے اور معصوم عن الخطأ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں) لیکن اگر کوئی بدنیتی مخالفتِ حق اور کبر و عناد میں مشہور ہو تو (احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کیلئے) اس کے ساتھ وہی معاملہ روا رکھا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

ایک انتہائی اہم سوال اور اس کا جواب

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ تم صفاتِ باری تعالیٰ میں تاویلیں کرنے والوں کو کافر کہو گے یا فاسق؟

ہم جواباً عرض کریں گے: کسی کو کافر یا فاسق قرار دینے کا فیصلہ کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے،

بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے سپرد ہے۔ تکفیر یا تفسیق، احکامِ شرعیہ میں سے ہے جس کا مرجع کتاب وسنت ہے، لہذا اس میں انتہائی درجہ کا تثبت ضروری ہے۔ کسی شخص کو اس وقت تک کافر یا فاسق نہ کہا جائے، جب تک اس کے کفر یا فسق پر قرآن اور حدیث کی دلیل نہ ہو۔

ہر وہ مسلمان جو ظاہر العدالۃ ہو اس کے تعلق سے اصلِ شرعی یہی ہے کہ اس کا مسلمان اور عادل ہونا قائم و برقرار ہے، لہذا جب تک کسی شرعی دلیل سے ان میں سے کسی چیز کا زائل ہونا معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک ہرگز ہرگز اس کی تکفیر یا تفسیق نہ کی جائے...... تکفیر و تفسیق میں تساہل برتنے والا دو انتہائی خطرناک وعیدوں کا مستحق بن جاتا ہے:

ایک یہ کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہو، اور آپ اس پر کفر کا فتویٰ صادر کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے مرتکب ہو جائیں، اس کے ساتھ ساتھ آپ کا فتویٰ شخصِ محکوم علیہ پر بھی بہتان وافتراء قرار پائیگا (جو کبائر میں سے ہے)

دوسری خطرناک وعید یہ ہے کہ کفر یا فسق کا جو حکم آپ نے اپنے بھائی پر لگایا ہے اگر وہ اس سے بری اور محفوظ ہے تو وہ فتویٰ آپ پر لوٹ آئے گا۔

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما ان النبی ﷺ قال: [اذا كفر الرجل أخاه فقد باء بها احدهما] وفی رواية: [ان كان كما قال والا رجعت إليه]

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: [اگر کسی شخص نے اپنے کسی بھائی کو کافر کہا تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہو جائے گا] ایک روایت میں یوں بھی وارد ہے: [اگر تو وہ اس کے کہنے کے مطابق کافر ہے، تو درست ورنہ وہ کفر کا حکم اس (کہنے والے) پر لوٹ آئے گا] (مسلم مع النووی: ۲/۴۹)

عن ابی ذر رضی الله عنه عن النبی ﷺ: [ومن دعا رجلا بالكفر أو قال: عدو الله وليس كذلك الا حار عليه] (مسلم)

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: [جس نے کسی شخص کو کافر یا اللہ کا دشمن کہا اور وہ ایسا نہیں ہے، تو پھر کہنے والا کافر اور اللہ کا دشمن قرار پائے گا]

لہذا کسی بھی مسلمان پر کفر یا فسق کا فتویٰ لگانے سے قبل دو چیزوں کو دیکھنا ضروری ہے:

☆ ایک یہ کہ قرآن یا حدیث کی نص موجود ہو کہ اس شخص کا کوئی قول یا فعل کفر کو موجب ومستلزم ہے۔

☆ دوسری چیز یہ کہ جس شخصِ معین کو اس کے کسی قول یا فعل کی بنیاد پر کافر یا فاسق کہا جارہا ہے، اس پر تکفیر یا تفسیق کی تمام شروط واقعتاً منطبق ہورہی ہیں، نیز یہ کہ تکفیر یا تفسیق کے جو موانع یا جو رکاوٹیں ہیں، وہ ان سب کو عبور کر چکا ہے۔

سب سے اہم شرط یہ ہے کہ جس مخالفت کی بناء پر اسے کافر یا فاسق کہا جارہا ہے، اسے علم ہو کہ یہ مخالفت، کفر یا فسق کو موجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:۱۱۵)

ترجمہ: (جو شخص باوجود راہِ ہدایت کے واضح ہوجانے کے بھی رسول اللہ ﷺ کا خلاف کرے اور تمام مؤمنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کردینگے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دینگے، وہ پہنچنے کی بہت بُری جگہ ہے)

نیز فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدَاهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّايَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (التوبۃ:۱۱۵،۱۱۶)

ترجمہ: (اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کرکے بعد میں گمراہ کردے جب تک کہ ان چیزوں کو صاف صاف نہ بتلادے جن سے وہ بچیں بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ہے)

اس لیئے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ فرائض کا انکار کرنے والا اگر نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے تو اسے اس وقت تک کافر نہیں کہا جاسکتا جب تک اسے ان فرائض سے آگاہ کرکے اس پر حجت قائم نہ کردی جائے۔

کسی پر کفر یا فسق کا حکم لگانے سے مانع یا رکاوٹ یہ ہے کہ کفر یا فسق (کا قول یا فعل) اس سے بلاقصد وارادہ ظاہر ہوا ہو، جس کی بہت سی صورتیں ہیں۔:

☆ ایک یہ کہ اسے کفر یا فسق (کے قول یا فعل) پر مجبور کردیا جائے، چنانچہ وہ برضاورغبت اور اطمنانِ قلب کے ساتھ نہیں، بلکہ مجبوری کے عالم میں اس کا مرتکب ہورہا ہے تو ایسی صورت میں اسے کافر یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهِ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (النحل:١٠٦)

ترجمہ: (جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، بجز اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو، مگر جو کوئی کھلے دل سے کفر کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کیلئے بہت بڑا عذاب ہے)

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر ایسی اغلاق کی حالت طاری ہوجائے کہ اسے اپنی بات کا احساس وادراک نہیں ہورہا، بندہ اس کیفیت سے اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ شدتِ فرح یا شدتِ غم یا شدتِ خوف وغیرہ کی کیفیت سے دوچار ہو۔ اس کی دلیل صحیح مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[لله أشد فرحا بتوبة عبده حين يتوب إليه من احدكم كان على راحلته

بارض فلاة فانفلتت منه وعليها طعامه فأيس منهافاتى شجرة فاضطجع فى ظلها قد أيس من راحلته فبينما هو كذلك اذ هو قائمة عنده فأخذ بخطامها ثم قال من شدة الفرح: اللهم انت عبدى وأنا ربک، اخطأ من شدت الفرح]

ترجمہ:[اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے توبہ کرنے کی خوشی اس بندے سے بھی زیادہ ہوتی ہے جو اپنی اونٹنی پر سوار کسی بے آب وگیاہ میدان میں محوِ سفر ہو کہ اچانک اس کی اونٹنی کھوجائے، اب اس اونٹنی پر اس کا کھانا اور پانی ہے، اب وہ تلاشِ بسیار کے بعد مایوس ہوکر کسی درخت کے سائے تلے لیٹ جاتا ہے، وہ اپنی سواری سے پوری طرح مایوس ہو چکا ہے، پھر اچانک نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، تو اسے اپنی اونٹنی سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہے، وہ دوڑ کر اس کی لگام تھام لیتا ہے اور شدتِ فرح سے اپنی زبان سے یہ جملہ بول جاتا ہے: اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں۔ چنانچہ وہ شدتِ فرح کی بناء پر یہ غلط جملہ بول جاتا ہے]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم (۱۸۰/۱۲) میں فرماتے ہیں:

''جہاں تک کسی کی تکفیر کا معاملہ ہے، تو اس بارہ میں درست بات یہ ہے کہ امتِ محمد ﷺ کا کوئی فرد اگر حق کی تلاش کی کوشش میں غلطی کر جائے تو اسے کافر نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی غلطی تو قابلِ معافی ہے، لیکن جس شخص پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان واضح ہو، وہ ہدایت پالینے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، اور سبیل المؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور راستہ کا پیروکار بن جاتا ہے تو وہ یقیناً کافر ہے۔ البتہ جو شخص اپنی خواہشات کا پیروکار رہا اور طلبِ حق میں کوتاہی کر جائے اور بلاعلم کوئی بات کہہ جائے تو وہ نافرمان اور گناہگار قرار پائے گا، یہ شخص بعض اوقات فاسق کہلاتا ہے اور بعض اوقات گناہگار تو ہوتا ہے لیکن اسکی نیکیاں گناہوں پر راجح اور غالب ہوتی ہیں۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۲۲۹/۲) میں مزید فرماتے ہیں:

'' میں اور میرے ساتھ مجلس کرنے والے اکثر ساتھی بخوبی جانتے ہیں کہ میں اس بات کا

سب سے بڑا منکر اور مخالف ہوں کہ کسی معین شخص کو کافر، فاسق یا عاصی یعنی نافرمان کہا جائے۔ الاّ یہ کہ یقینی علم ہو جائے کہ اس معین شخص پر کتاب وسنت کی دلیل کی حجت قائم ہو چکی ہے، ایسی دلیل جس کا مخالف کبھی تو کافر ہوتا ہے، کبھی فاسق اور کبھی عاصی۔ اور میں یہ بات بھی ذکر کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطأ کو معاف فرمادیا ہے، خواہ وہ خطأ مسائلِ خبریہ قولیہ سے متعلق ہو یا مسائلِ عملیہ کے۔ (مسائلِ خبریہ کی مثال صفاتِ باری تعالیٰ سے اور مسائلِ عملیہ کی مثال صلاۃ وصیام وغیرہ سے دی جاسکتی ہے)۔ اس قسم کے بہت سے مسائل میں سلف صالحین کا آپس میں نزاع وخلاف موجود اور قائم ہے، لیکن کسی نے کسی کو کبھی کافر، فاسق یا عاصی نہیں کہا۔''

شیخ الاسلام نے اس کی کچھ مثالیں بھی ذکر فرمائیں، پھر فرمایا:

'' میں یہ بھی بیان کرتا رہتا ہوں کہ سلفِ صالحین اور ائمہ کرام کے کلام سے بعض مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر بھی منقول ہے، وہ بھی حق ہے، لیکن ضروری ہے کہ تکفیرِ مطلق اور تکفیرِ معین کے فرق کو سمجھا جائے۔''

(مزید فرماتے ہیں):'' تکفیر کا عمل ایک بڑی وعید شمار ہوتا ہے (لہذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے) بعض اوقات ایک شخص کا قول بظاہر رسول اللہ ﷺ کی تکذیب پر منتج ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے وہ شخص نیا نیا اسلام میں داخل ہو یا ممکن ہے کہ وہ کسی دور دراز دیہات کا رہنا والا ہو (کہ اس تک وہ علم پہنچا ہی نہ ہو) اب یہ شخص انکار کے باوجود اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جائے گا جب تک اس پر وہ علم پہنچا کر حجت قائم نہ کرلی جائے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے ایک شخص نے وہ نصوص سنے ہی نہ ہوں، یا سنے ہوں لیکن وہ اسکے نزدیک ثابت نہ ہوں یا کسی دوسرے معارض کی وجہ سے اس نے کوئی تاویل کررکھی ہو، خواہ وہ تاویل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ میں ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا ذکر کرتا رہتا ہوں جو صحیح بخاری ومسلم میں مروی ہے، جس میں اُس شخص کا قصہ مذکور ہے، جس نے اپنے بیٹوں کو اپنی موت سے قبل لاش کو جلادینے اور اس کی راکھ کو ہواؤں میں بکھیرنے اور

سمندر کی لہروں کے سپرد کر دینے کی وصیت کی تھی، اس شخص نے یہ الفاظ بھی کہے تھے ''اگر اللہ مجھ کو پکڑنے پر قادر ہو گیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو تمام جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا ہو گا'' بیٹوں نے وصیت نافذ کر دی، اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر کے پوچھا: تم نے جو کچھ کیا اس پر تمہیں کس چیز نے اُبھارا؟ اس نے کہا تیری خشیت نے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا۔

اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی قدرت پہ شک کیا تھا، وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ جب میں جلا کر، راکھ بنا کر اڑا دیا جاؤں گا تو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عقیدہ کفر ہے، جس کے کفر ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے، لیکن یہ شخص جاہل تھا، اور اس مسئلہ کا علم نہیں رکھتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ مؤمن تھا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف میں مبتلا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا۔

تو پھر وہ شخص جو کسی مسئلہ میں متاول ہے، (خواہ وہ تاویل غلط ہی کیوں نہ ہو) دین میں نیک نیتی سے اجتہاد کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی متابعت پر حریص بھی ہے، وہ اس جلائے جانے والے انسان کی بہ نسبت زیادہ معافی ومغفرت کا مستحق ہے۔''

اس تقریر سے قول اور قائل اور فعل اور فاعل کے مابین فرق واضح ہو گیا، چنانچہ ہر قول یا فعل، کفر یا فسق نہیں ہوتا کہ جس کے قائل یا فاعل پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے مجموع الفتاویٰ (۳۵/۱۶۵) میں فرمایا ہے: '' اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ مقالہ جس کا کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے کفر ہونا ثابت ہو جائے، اس مقالہ کے بارہ میں کہا جائے گا کہ یہ دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں کلمۂ کفر ہے (نہ کہ اس کے قائل کو کافر کہا جائے گا) کیونکہ کسی بھی شخص کا ایمان ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ثبوت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین سے ہوتا ہے، تو پھر دوسرے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ محض اپنے ظنون یا خواہشات ومیلانات کی روشنی میں اس شخص کے کفر کا حکم لگاتے پھریں...... لہذا یہ بات ضروری نہیں کہ اس مقالۂ کفر کے کہنے والے ہر شخص کی تکفیر کر دی جائے، جب تک اس کے حق میں شروطِ تکفیر ثابت نہ

ہو جائیں، اور موانعِ تکفیر منتفی یا زائل نہ ہو جائیں۔ جیسے ایک شخص شراب یا سود کو حلال کہتا ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ یا تو وہ نیا نیا مسلمان ہوا ہے، یا کسی دور دراز دیہات میں رہنے کی وجہ سے وہ اس مسئلہ سے ناواقف اور نا آشنا ہے، یا مسئلہ تو اس تک پہنچا لیکن اس کا قرآن وحدیث سے ثابت ہونا اسے معلوم نہ ہوا ہو...... تو ایسے شخص کو اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اس پر حجت بالرسالۃ قائم نہ ہو جائے، جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر ہے:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء:۱۶۵)

ترجمہ: (تاکہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر رہ نہ جائے)

جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے خطاً ونسیان کو معاف فرما دیا ہے۔

ثابت ہوا کہ بعض اوقات ایک قول یا عمل کفر یا فسق ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کا کہنے یا کرنے والا کافر یا فاسق ہو۔ یا تو اس لیئے کہ اس کی تکفیر یا تفسیق کی شرط موجود نہیں، یا کوئی ایسا شرعی عذر موجود ہے جو اس کے کافر یا فاسق ہونے کو مانع ہے۔

لیکن جس شخص پر حق واضح ہو جائے، لیکن وہ اپنے مذہب کی پیروی یا اپنے لیڈر یا امام کی تقلید یا دنیا کی کسی اور وجہِ ترجیح کی بناء پر اس کی مخالفت وانکار پر مصر ہے۔ تو یہ شخص اس حکم کا مستحق بن جاتا ہے، جس کا وہ قول یا فعل متقاضی ہے، خواہ وہ کفر ہو یا فسق۔

لہٰذا ایک مؤمن پر یہ بات فرض اور متعین ہے کہ وہ اپنے ہر عقیدہ وعمل کی اساس کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کو قرار دے دے۔ کتاب وسنت کو اپنا ایسا امام ومقتدیٰ تسلیم کر لے کہ انہی کے نور سے ہمیشہ روشنی حاصل کرے، اور انہی کے طریق ومنہاج پر پوری زندگی چلتا رہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جسے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:۔

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام:۱۵۳)

ترجمہ: (اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پہ چلو اور دوسری راہوں پہ مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو)

اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے مسلک سے ڈرتا اور بچتا رہے جو کسی مذہبِ معین کو اپنے ہر عقیدہ وعمل کی اساس قرار دیتے ہیں، اور جب کتاب وسنت کے نصوص کو اپنے مذہب کے خلاف پاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان نصوص کو من مانی تاویلیں کر کے مطابقِ مذہب بنالیں۔ اور اس سلسلہ میں ظلم، عناد اور تعصب پر مبنی ایسی تاویلیں کر جاتے ہیں، کہ قرآن وحدیث گویا تابع ہیں نہ کہ متبوع، اور اقوالِ مذہب، امام ومقتدیٰ ہیں نہ کہ تابع۔ (ولاحول ولاقوۃ الاباللہ)

یہ طریق اور منہج ان لوگوں کا ہے جو ذاتی خواہشات کے غلام ہیں، نہ کہ ان کا جو اخلاص کے ساتھ ہدایت کے پیروکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس منہج کی شدید مذمت فرمائی:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (المؤمنون:۷۱)

ترجمہ: (اگر حق ہی ان کی خواہشوں کا پیرو ہو جائے تو زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درھم برھم ہو جائے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان کی نصیحت پہنچادی ہے لیکن وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں)

من مانی خواہشات کے پیروکاران لوگوں کے مذاہب ومسالک دیکھنے والے شخص پر ان کے بڑے عجیب وغریب حقائق منکشف ہوتے ہیں، پھر وہ بڑی شدت والحاح سے اپنے پروردگار کی طرف رجوع اختیار کر کے، گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی ہدایت اور اس پر ثابت قدمی کی دعا کرتا ہے، نیز ہر گمراہی اور الحاد وانحراف سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا سوال کرتا رہتا ہے،......اور جو شخص صدق واخلاص کے ساتھ یہ سوچ کر دعائیں کرے کہ میرا پروردگار تو بے پرواہ وبے نیاز ہے، میں ہی

اس کے در کا محتاج، مفتقر اور بھکاری ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمالیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرة:۱۸۶)

ترجمہ: (جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں اس لیئے لوگوں کو بھی چاہیئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے)

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس زمرے میں شامل فرمالے جو حق کا حق ہونا جانتے ہیں اور پورے اخلاص سے اس کی پیروی کرتے ہیں اور باطل کا باطل ہونا جانتے ہیں اور پوری شدومد سے اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنادے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہمیں اپنی اور پھر دوسروں کی اصلاح کی توفیق عطا فرمادے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد کجرو اور ٹیڑھا نہ کردے۔ اور ہمیں اپنی بھرپور رحمت عطا فرمادے کہ وہی عطا فرمانے والا ہے۔

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کیلیئے ہیں کہ جس کی توفیق واحسان سے نیک اور اچھی چیزیں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ پر درود وسلام کی موسلا دھار بارش برسادے کہ جو سراسر رحمت ہیں اور اُمت کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے صراطِ مستقیم کا راستہ دکھانے والے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ آپ کی آل واصحاب اور قیامت تک ان کے بہترین پیروکاروں پر بھی رحمتیں اور سلامتیاں نازل فرمائے۔ (آمین)

(شوال کی پندرہ تاریخ ۱۴۰۴ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت

کے متعلق شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کے اس مقالے کا مکمل متن جو مجلۃ الدعوۃ سعودی عرب میں شائع ہوا

شمارہ نمبر(۹۱۱) تاریخ اشاعت ۴/۱/ ۱۴۰۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونتوب إليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلامضل له ومن يضلل فلاهادی له، وأشهد ان لااله الا الله وحده لاشريك له،وأشهد ان محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان وسلم تسليما.

ہم نے اپنی ایک مجلس میں اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کا معنی ومفہوم ذکر کیا تھا، جسے بعض لوگ ہمارے مقصود ومراد،اور ہمارے عقیدے کے بالکل خلاف سمجھ بیٹھے،نتیجۃً لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے بارہ میں بہت زیادہ استفسار شروع کردیا۔ہم نے یہ سوچ کر:

☆ کوئی شخص ہماری گفتگو سے غلط معنی اخذ کر کے اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے متعلق ایسا عقیدہ نہ اپنالے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو۔

☆ نیز کوئی شخص ہماری طرف صفتِ معیت کے حوالے سے ایسی بات نہ منسوب کردے جو ہم نے کہی ہی نہیں،یا کوئی شخص ہماری اس گفتگو کے حوالے سے ایسے وہم کا شکار نہ ہوجائے جو قطعی ہمارا مقصود نہ ہو۔

☆ نیز اس صفتِ عظیمہ جس کا قرآنِ حکیم کی متعدد آیات اور رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں ذکر موجود ہے، کا صحیح معنی بیان کرنے کیلئے،

ہم درج ذیل امور بیان کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت (یعنی خلق کے ساتھ ہونا) کتاب وسنت اور اجماعِ

سلف سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے) (النحل:۱۲۸)

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو فرمایا:

﴿لا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرٰى﴾ (طہ:۴۶)

ترجمہ: (تم مطلقاً خوف نہ کرو، میں اب تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہونگا)

اپنے پیغمبر محمد ﷺ کے متعلق (جبکہ وہ غار میں تھے،) فرمایا:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ: (اگر تم ان کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی، اس وقت جب کہ اسے کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [افضل الایمان ان تعلم ان اللہ معک حیثما کنت]

ترجمہ: [افضل ایمان یہ ہے کہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہو کہ تم جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے]

اس حدیث کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے العقیدۃ الواسطیۃ کے اندر حسن قرار دیا ہے، جبکہ بعض اہلِ علم سے اس کا ضعیف ہونا مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ کے متعلق اپنی معیت کے اثبات کے حوالے سے فرمان پیچھے گزر چکا ہے۔

اس کے علاوہ سلف صالحین کا اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کے اثبات پر اجماع قائم ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت حق ہے اور اپنی حقیقت پر قائم ہے، ایسی حقیقت جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے، جو ہر مخلوق کی تشبیہ سے پاک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: (اس جیسی کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ (مریم:۶۵)

ترجمہ: (کیا تیرے علم میں اس کا ہم نام اور بھی ہے)

نیز فرمایا: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (اخلاص:۴) ترجمہ: (اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے)

الغرض، جس طرح اللہ رب العزت کی دیگر تمام صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کیلئے ایسی حقیقت کے ساتھ ثابت ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان ہے، اور وہ صفات، مخلوقات کی صفات کے قطعاً مشابہ نہیں (اسی طرح صفتِ معیت کے حوالے سے ہمارا عقیدہ ہے)

حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں: اہل السنۃ کا اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات جو قرآن وسنت میں وارد ہوئی ہیں کے اثبات پر اجماع ثابت ہے، اسی طرح ان پر ایمان لانے، اور انہیں مجاز کے بجائے حقیقت پر محمول کرنے پر بھی اجماع ثابت ہے۔ اہل السنۃ نہ تو کسی صفت کی تکییف کرتے ہیں، نہ کسی صفت کو حد میں محدود کرتے ہیں۔

ابن عبد البر کے اس قول کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتویٰ الحمویۃ (۸۷/۵) میں نقل فرمایا ہے۔

شیخ الاسلام الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۲/۵) میں فرماتے ہیں:

"کوئی شخص کتاب وسنت میں وارد ہونے والی اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں یہ نہ سمجھے کہ

ان میں آپس میں تناقض وتعارض پایا جاتا ہےاوراس کی مثال یہ پیش کرے کہ قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''استواء علی العرش'' اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکورصفتِ معیت کے خلاف ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (تم جہاں بھی ہووہ تمہارے ساتھ ہے)

اسی طرح اس حدیث کے بھی خلاف ہے:

[اذاقام احدکم الی الصلاة فان الله قبل وجهه]

ترجمہ:[جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے]

ان نصوص میں تناقض کا دعویٰ غلط ہے۔اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونا بھی حقیقت ہےاور اس کا عرش پر مستوی ہونا بھی حقیقت ہے،اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حقیقتوں کو اپنے اس فرمان میں جمع فرمادیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَايَخْرُجُ مِنْهَا وَمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَايَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی ہوگیا،وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے،اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ اپنے عرش کے اوپر ہے،کائنات کی ہر چیز کو جانتا ہے،اور ہم جہاں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے۔یہی بات حدیث الاوعال میں مذکور ہے[والله فوق العرش وهو يعلم ما أنتم عليه]یعنی (اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور تمہارے ہر معاملے کو جانتا ہے)

اس کی تفصیل یوں ہے کہ لغتِ عربیہ میں" لفظ"مــع"یعنی (ساتھ ہونا) جب استعمال کیا جائے گا تو لغت میں اس کا ظاہری معنی مطلقاً مقارنت ومصاحبت ہی ہوگا،معیت کے معنی میں چھونا یا دائیں بائیں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔جب سیاقِ کلام کے پیشِ نظر"مع" کے کسی معنی کو مقید کیا جائے گا تو اسی معنی کی مقارنت مراد ہوگی۔

کہاجاتا ہے:"مازلنا نسير و القمر معنا او النجم معنا"ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ رہا، یافلاں ستارہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔اسی طرح اپنا سامان اگرچہ آپ نے اپنے سر کے اوپر اٹھا رکھا ہو مگر آپ کہتے ہیں:"هذا المتاع معي"(یہ سامان میرے ساتھ ہے)

لہذا اللہ تعالیٰ حقیقتاً اپنی خلق کے ساتھ بھی ہے اور حقیقتاً اپنے عرش کے اوپر بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی خلق کا از روئے علم،قدرت،سمع،بصر،غلبہ،تدبیر اور دیگر تمام معانی ربوبیت کے ساتھ احاطہ کیئے ہوئے ہے......اب یہ معیت اگر سیاقِ عموم میں مذکور ہے تو اس سے کوئی شخص یا وصف مستثنیٰ نہیں ہوگا، بلکہ وہ پوری مخلوق کے ساتھ ہر حال میں ہوگی۔جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾(الحدید:۴)

ترجمہ:(اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

اسی معیتِ عامہ پر مشتمل ہے۔جس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے،تم جہاں بھی ہو......اس سے کوئی فرد،یا اس کی کوئی حالت مخصوص یا مستثنیٰ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی یہی معیتِ عامہ مذکور ہے:

﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾(المجادلۃ:۷)

ترجمہ:(تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا

وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں)

اور اگر صفتِ معیت کا سیاقِ خاص میں ذکر ہے، مثلاً: کسی شخص یا وصف کے ساتھ معیت کو مخصوص کیا گیا ہے تو یہ معیتِ خاصہ کہلاتی ہے، جس میں علم واحاطہ کے معنی کے ساتھ ساتھ ایک اضافی معنی بھی پیدا ہو جائے گا اور وہ ہے مدد کرنا، تائید فرمانا، ہدایت وتوفیق عطا فرمانا وغیرہ۔

کسی شخص کے ساتھ مخصوص معیت کی مثال، اللہ تعالیٰ کا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمانا:

﴿ اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَأَرٰی ﴾ (طہ:۴۶)

ترجمہ: (میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہونگا)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا محمد ﷺ کے متعلق فرمان ہے:

﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ: (جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے)

(ان دونوں آیتوں میں معیتِ خاصہ کا ذکر ہے، جس میں اضافی طور پر نصرت وتائید کا معنی موجود ہے۔)

کسی وصف کے ساتھ مخصوص معیت کی مثال، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ﴾ (الانفال:۴۶)

ترجمہ: (صبر کرو! بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

قرآنِ حکیم میں اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتاویٰ الحمویۃ (۱۰۳/۵) میں فرماتے ہیں:

" حسبِ مقام، معیت کے احکام ومعانی مختلف ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْھَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ أَیْنَ مَاکُنْتُمْ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

اس آیت کا ظاہر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں معیت کا حکم، مقتضیٰ یا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر مطلع ہے، گواہ ہے، تمہیں جانتا ہے، اور تمہارا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

سلفِ صالحین کا ''وھو معکم'' کی تفسیر میں ''معھم بعلمه'' (وہ اپنے علم کے اعتبار سے ان کے ساتھ ہے۔) کا یہی معنی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں صفتِ معیت کا یہی ظاہر وحقیقت ہے۔

جب نبی ﷺ نے غار کے اندر اپنے دوست سے کہا: ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (پریشان نہ ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے)

تو یہاں بھی معیت اپنی حقیقت وظاہر پر قائم ہے، آیت کا سیاق یہ دلالت کر رہا ہے کہ یہاں معیت، اطلاع کے معنی کے ساتھ ساتھ، نصرت وتائید کے معنی پر بھی مشتمل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی معیت کے معنی میں نصرت وتائید کا مفہوم شامل ہے

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے) (النحل: ۱۲۸)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمانا:

﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طٰہٰ: ۴۶)

ترجمہ: (میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہونگا)

یہاں بھی معیت کا ظاہری معنی علم واحاطہ کے ساتھ ساتھ نصرت وتائید ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ آگے مزید فرماتے ہیں: ''معیت کے معنی ومقتضیٰ میں فرق موجود ہے، بعض اوقات سیاقِ کلام کے مطابق معیت کا جو مقتضیٰ ہوتا ہے وہی اس کا معنی ہوتا ہے، لہذا

سیاقِ کلام کی مناسبت سے معانی مختلف ہوسکتے ہیں۔''

محمد بن الموصلی اپنی کتاب'' استعجال الصواعق المرسلةعلى الجهمية والمعطلة لابن القيم '' کی مثال نمبر۹ اور ص ۴۰۹ میں فرماتے ہیں:

'' لفظِ ''مع '' کے تعلق سے غایتِ کلام یہ ہے کہ یہ کسی بھی امر میں مصاحبت، مقارنت اور موافقت پر دلالت کرتا ہے، اور ہر مقام پر سیاقِ عبارت کی روشنی میں اس مقارنت کا حسبِ مقام معنی متعین ہوگا۔ جب یہ کہا جائے ''اللہ مع خلقه ''یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ ہے، تو یہ عموم ہے جس کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جانتا ہے، ان پر قدرت رکھتا ہے، اور ان کے جملہ امور کی تدبیر فرماتا ہے، لیکن جب لفظِ ''مع '' کا ذکر مخصوص پیرائے میں ہوگا جیسے قولہ تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے) (النحل:۱۲۸)

تو یہاں مقارنت کے ساتھ ساتھ نصرت، تائید اور معونت کا معنی بھی لازماً شامل ہوگا۔

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی بندوں کے ساتھ معیت دو قسم کی ہے ،ایک معیتِ عامہ اور دوسری معیتِ خاصہ۔ قرآن حکیم نے معیت کی ان دونوں قسموں کو ذکر کیا ہے، محض لفظی اشتراک کے طور پر نہیں، بلکہ معیت وصحبت کی جو حقیقت اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، اسی حقیقت کے ساتھ۔''

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے ''الاربعين النووية '' کی ۲۹ ویں حدیث کی شرح کے ضمن میں فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی معیتِ خاصہ ،نصرت ،تائید ،حفاظت واعانت کی متقاضی ہے ،جبکہ معیتِ عامہ، اللہ تعالیٰ کا بندوں پر علم واحاطہ اور انکے تمام اعمال کی مکمل نگرانی کی متقاضی ہے''

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ سورۃ المجادلۃ کی آیتِ معیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

'' بہت سے علماء نے اجماع نقل کیا ہے کہ یہاں معیت سے مراد معیتِ علم واحاطہ ہے

اور بلاشبہ یہ مراد لینا محمول بر حقیقت ہے۔اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی ہر بات سنتا اور ہر چیز دیکھتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی خلق کے تمام احوال وامور پر پوری طرح مطلع ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں''

(۴) اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق ، کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق کے ساتھ مختلط یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہے،صفتِ معیت کا یہ معنیٰ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں باطل اور ناممکن ہے،لہذا یہ معنی کسی بھی صورت جائز نہیں ہے اور یہ بات بھی جائز بلکہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کا کوئی کلام باطل یا ناممکن اور محال معنی پر مشتمل ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ العقیدۃ الواسطیۃ (ص:۱۱۰) میں فرماتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ کے فرمان:''وھو معکم '' کا یہ معنی نہیں ہے کہ خلق کے ساتھ مختلط ہے۔لغت ''مع '' کے اس معنی کو ہر جگہ ضروری قرار نہیں دیتی۔چاند اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی نشانی ہے، جو آسمان میں رکھی گئی ہے اور وہ ہر مسافر وغیر مسافر کے ساتھ ہے،خواہ وہ کہیں بھی چلے جائیں۔''

یہ معنی باطل ہے، پرانے جہمیہ میں سے صرف فرقہ حلولیہ نے مراد لیا ہے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے،اللہ تعالیٰ ان کی اس بات سے، بہت بلند ہے، وہ اپنے منہ سے بہت بڑی اور ناگوار بات کہہ گئے،اور وہ تو ہیں ہی بڑے جھوٹے۔

حلولیہ جہمیہ کا یہ قول ائمہ سلف میں سے جس جس تک پہنچا انہوں نے اس کی شدید نکیر فرمائی، کیونکہ اس مذہب سے بہت سے باطل امور لازم آتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف بہت سے نقائص منسوب کرنے،اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کا انکار کرنے کو مشتمل و متضمن ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر جگہ موجود اور اپنی خلق کے ساتھ مختلط ہے، حالانکہ اس کا فرمان ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾(البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ:(اوراس کی کرسی کی وسعت نے زمین وآسمان کوگھیر رکھا ہے)

نیزفرمایا:﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهٖ﴾

ترجمہ:(ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی،اورتمام آسمان اسکے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہونگے)(الزمر:٦٧)

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ''معیت مع الخلق ''اس کے''علو علی الخلق ''اور''استواء علی العرش ''کے منافی یامتناقض نہیں ہے،کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے مطلقاً علوثابت ہے،جواللہ تعالیٰ کی ذات اوراسکی صفت (اورمرتبہ ومقام)دونوں کوشامل ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾(البقرۃ:٢٥٥)

ترجمہ:(وہ تو بہت بلنداور بہت بڑا ہے)

نیزفرمایا:﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾(الاعلیٰ:١)

ترجمہ:(اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر)

نیزفرمایا:﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾(النحل:٦٠)

ترجمہ:(اللہ کیلئے تو بہت ہی بلند صفت ہے،وہ بڑا ہی غالب اور باحکمت ہے)

قرآن،حدیث،اجماع،عقل اورفطرت،ان تمام سے اللہ تعالیٰ کے علو(سب سے بلند ہونا) پر بہت سے ادلہ موجود ہیں۔

قرآن وحدیث کے دلائل کا توشمار ہی ممکن نہیں ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ﴾(غافر:١٢)

ترجمہ:(پس اب فیصلہ اللہ بلندو بزرگ ہی کا ہے)

نیزاللہ تعالیٰ کا فرمان:﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾(الانعام:٦١)

ترجمہ:(اوروہی اپنے بندوں کے اوپر،غالب ہے برتر ہے)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ءَ أَمِنتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ (الملک:١٦)

ترجمہ: (کیا تم اس بات سے بے خوف ہوگئے کہ جو ذات آسمان پر ہے، تمہیں زمین میں دھنسا دے)

نیز فرمایا: ﴿تَعْرُجُ الْمَلَا ئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ (المعارج:۴)

ترجمہ: (جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں)

نیز فرمایا: ﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (النحل:١٠٢)

ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل لے کر آئے ہیں)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ألا تأمنونی وأناأمين من فی السماء]

یعنی (تم مجھے امین کیوں نہیں مانتے، حالانکہ میں اس ذات کا امین ہوں جو آسمان پر ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا [والعرش فوق الماء والله فوق العرش] یعنی [عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر] (طبرانی کبیر (۲۰۲/۹) شیخ البانی نے صحیح الاسناد کہا ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ولا يصعد الى الله الا الطيب]

ترجمہ: [اللہ تعالیٰ تک تو صرف حلال اور پاکیزہ چیزیں چڑھتی ہیں]

اسی طرح عرفہ کے دن جب صحابہ کرام نے یہ اقرار واعتراف کیا کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا کر دیا ہے، تو آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا:

[اللهم أشهد] (اے اللہ تو گواہ رہ)

اسی طرح جب آپ ﷺ نے لونڈی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان پر، تو آپ ﷺ نے فرمایا: [اعتقها فانها مؤمنة] (اسے آزاد کردو، یہ مؤمنہ ہے۔)

اس معنی کی اور بہت سی احادیث ہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علو کے اثبات پر اجماع کا تعلق ہے،تو بہت سے اہلِ علم نے اللہ تعالیٰ کے علو پر سلف صالحین کا اجماع نقل کیا ہے۔

جہاں تک دلیلِ عقل کا تعلق ہے،تو عقل اس امر کی متقاضی ہے کہ علو (بلندی) صفتِ کمال اور سفل (پستی) صفتِ نقص ہے،اور اللہ ربّ العزّت ہر صفتِ کمال سے متصف اور ہر صفتِ نقص سے منزّہ ہے۔

جہاں تک دلیلِ فطرت کا تعلق ہے تو ہر دعا کرنے والا جب اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے تو اس کے دل سے جہتِ علو کی طرف متوجہ ہونے کی آواز اٹھتی ہے،حالانکہ یہ بات اس نے نہ کسی کتاب میں پڑھی،نہ کسی معلّم سے سیکھی ہوتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے اتنے قطعی دلائل کے ساتھ جو علو ثابت ہے،وہ معیت مع الخلق کی حقیقت کے مناقض یا معارض نہیں ہے،اور اسکی کئی وجوہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں اپنے متعلق خود ان دونوں حقیقتوں کو جمع فرمادیا ہے،جبکہ قرآنِ حکیم ہر تناقض سے پاک ہے،اور اگر ان دونوں صفات کی حقیقت میں کوئی تعارض یا تناقض ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہرگز قرآن میں جمع نہ فرماتا۔اور اگر قرآن مجید میں بظاہر کہیں آپ کو تعارض محسوس ہورہا ہوتو وہاں بار بار تفکر اور تدبر کرو،حتی کہ تعارض رفع ہوکر مسئلہ واضح ہوجائے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾

ترجمہ:(یہ لوگ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بڑا اختلاف اور تناقض پاتے)(النساء:۸۲)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ معیت اور علو دونوں حقیقتوں کا ایک مخلوق کی ذات میں جمع ہونا ممکن ہے،جیسا کہ کہا جاتا ہے:''مازلنا نسير والقمر معنا''(ہم چلتے رہے اور چاند

ہمارے ساتھ تھا) حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ چلنے والے تو زمین پر چل رہے ہیں اور چاند آسمان پر ہے، جب یہ بات ایک چھوٹی سی مخلوق کے بارہ میں ممکن ہے، تو وہ خالق جو ہرشئ کا احاطہ کرنے والا ہے کے بارہ میں کیا خیال ہے؟

شیخ محمد خلیل ہراس نے شرح العقیدۃ الواسطیۃ میں شیخ الاسلام کی ذکر کردہ اس مثال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

'' شیخ الاسلام نے چاند کی مثال بیان فرمائی ہے جو آسمان پر ہے، اور جو مسافر کے ساتھ ساتھ بھی ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں بھی پہنچ جائے، تو جب علو اور معیت کا چاند کے حق میں جمع ہونا ممکن ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی مخلوق ہے، تو اس پروردگار کے حق میں ممکن نہیں؟ جو لطیف وخبیر ہے، جو اپنے تمام بندوں کا علماً وقدرۃً احاطہ کیئے ہوئے ہے، جو ان پر گواہ ہے، اور اپنے سمع وبصر سے ان کے ہر امر پر مطلع ہے، جو ان کے خفیہ بھیدوں اور سرگوشیوں تک کو جانتا ہے، بلکہ آسمانوں اور زمینوں سمیت پورا عالم، اور عرش سے فرش تک ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہے جیسے ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں چھوٹی سی گولی ہوتی ہے۔

تو جس پروردگار کی یہ شان ہے اس کیلئے کیا یہ بات ناممکن ہے کہ وہ مخلوق سے بلند اور اپنے عرش پر ان سے جدا ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ساتھ ہو؟

(۳) اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ علو اور معیت کا بحقِ مخلوق جمع ہونا ممکن نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بحقِ خالق بھی ان کا جمع ہونا ناممکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مشابہ یا مماثل نہیں ہے: ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''العقیدۃ الواسطیۃ'' (ص:۱۱۶) میں فرماتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ نے جو قرآن وحدیث میں اپنے بندوں کے ساتھ اپنے قرب اور معیت کا ذکر فرمایا

ہے، یہ اس کے علو اور فوقیت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات میں اللہ تعالیٰ جیسا کوئی نہیں، وہ قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند بھی ہے، اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ قریب بھی ہے''

ہماری اس بحث کا خلاصہ یہ ہے:

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق قرآن، حدیث اور اجماع سلف سے ثابت ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت حق ہے اور اپنی اُس حقیقت پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معیت ایسی نہیں جیسی ایک مخلوق کی دوسری مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ از روئے علم، قدرت، سمع، بصر، غلبہ، تدبیر اور دیگر معانی ربوبیت کے ساتھ اپنی تمام مخلوق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اور معیت کا یہ معنی تب ہوگا جب معیت سے مراد معیتِ عامہ ہوگی، اور اگر معیتِ خاصہ کا ذکر ہوگا تو پھر علم واحاطہ کے ساتھ ساتھ معیت کا معنی نصرت، تائید، توفیق اور تسدید (سیدھا کرنا) ہوگا۔

☆ صفتِ معیت ہرگز اس امر کو متقاضی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق میں مختلط یا حلول کیئے ہوئے ہے، معیت کا یہ معنی کسی صورت نہیں بنتا۔

☆ ان تمام باتوں پر تدبر کرنے سے یہ بات واضح اور ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی خلق کے ساتھ ہونا ایک حقیقت ہے، اور اس کا آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہونا بھی ایک حقیقت ہے، اور ان دونوں حقیقتوں میں کوئی منافات یا تعارض نہیں ہے۔ سبحانه وبحمده لانحصي ثناء عليه هو كما أثنى على نفسه، وصلى الله على عبده ورسوله محمد وآله وصحبه اجمعين

محمد الصالح العثيمين

۱۴۰۳ھ